کیمبرج یونیورسٹی کے جدید نصاب کے مطابق

او لیول اُردو

(2015ء-2016ء)

SYLLABUS-A

Paper: 2

ڈاکٹر سید ندیم جعفر

شعبۂ اُردو ایچیسن کالج لاہور

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Nadeem Jaffar, Dr. Syyed
O-Level Urdu (2015-2016) Paper: 2/
Dr. Syyed Nadeem Jaffar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2014.
252pp.
1. Urdu Literature (Classical and Modern) - Text Book. I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

2014ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2818-2
ISBN-13: 978-969-35-2818-3

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

مصنف کے با

نام:
تعلیم:
سرگرمیاں:
مصروفیات:
تصانیف:
ای میل:
رابطہ:
موبائل:

angemeel.com
969-35-2818-2
978-969-35-2818-3
693 528183

انتساب

ابّا (مرحوم) کے نام جن کی ہمت اور

حوصلے نے میرے اندر خوداعتمادی پیدا کی

اور

اماں کی انوکھی محبت کے نام جس سے میں محروم ہو گیا ہوں

اور

بہن یاسمین (مرحِومہ) کی علم دوستی کے نام

ترتیب

پیش لفظ 9

افسانے

افسانہ ـــ تعارف 11

☆منشی پریم چند ـــ تعارف 17

عیدگاہ 19

تجزیاتی مطالعہ 29

☆احمد ندیم قاسمی ـــ تعارف 32

جوتا 34

تجزیاتی مطالعہ 40

☆یونس جاوید ـــ تعارف 43

دستک 44

تجزیاتی مطالعہ 49

☆غلام عباس ـــ تعارف 52

اوورکوٹ 54

تجزیاتی مطالعہ 61

☆انتظار حسین ـــ تعارف 64

آخری آدمی 65

تجزیاتی مطالعہ 71

بادل	74
تجزیاتی مطالعہ	77

مضامین

☆مولانا محمد آزاد حسین ـــــ تعارف	83
انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا	85
تجزیاتی مطالعہ	89
☆فرحت اللہ بیگ ـــــ تعارف	92
مردہ بدست زندہ	94
تجزیاتی مطالعہ	99
☆احمد شاہ بخاری پطرس ـــــ تعارف	102
ہاسٹل میں پڑنا	104
تجزیاتی مطالعہ	113

غزلیات

☆میر تقی میرؔ ـــــ تعارف	119
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا	121
غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ	129
☆مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ـــــ تعارف	137
سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں	139
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے	149
☆حکیم مومن خان مومنؔ ـــــ تعارف	156
یہ عذرِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا	158
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم	166

☆ پروین شاکر ـــــ تعارف	174
کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی	175
تراش کر مرے بازو اُڑان چھوڑ گیا	179

نظمیں

☆ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ـــــ تعارف	189
خطاب بہ جوانانِ اسلام	190
☆ مولانا الطاف حسین حالی ـــــ تعارف	197
مسدسِ حالی	198
☆ حفیظ جالندھری ـــــ تعارف	206
انسانِ کامل کی برکات	207
☆ تنقیدی پیراگراف	217

پیش لفظ

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ ''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ'' اس لئے زبان کو شعور کی معروضی صورت کہا جاتا ہے۔ انسان جو کچھ سوچتا ہے اس کا اظہار لفظوں کے ذریعے ہی ممکن ہے انہیں لفظوں کا تخلیقی اظہار جب فنی لوازمات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو شعر کہلاتا ہے۔ زبان انسان کی ایک سماجی سرگرمی کا نام بھی ہے جس نے ضرورتوں کے اظہار کی کوششوں کے نتیجے میں جنم لیا۔ زمانی تبدیلیوں اور ضروریات کے ساتھ انسانی سوچ، خواب اور اس کے ارمانوں کو بھی تخلیقی سطح پر ظاہر کیا گیا جسے افسانہ، ناول اور شاعری کا نام دیا گیا۔ ان اصناف کا مطالعہ تفریح کے ساتھ زندگی کو شعور بخشتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں جو اصناف ادب پڑھائی جاتی ہیں ان کا مقصد طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے ساتھ انہیں شعور زندگی بخشنا ہوتا ہے۔ معلم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ طلباء کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے اظہار کے ایسے پیرائے اختیار کرے کے طلبا تک خیالات کا مکمل ابلاغ ہو سکے۔

اظہار و ابلاغ کا معاملہ کمرۂ جماعت تک ہی محدود نہیں بلکہ کتب کے حوالے سے بھی ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ آج اساتذہ کی ایک کثیر تعداد او لیول کے طلباء کے لئے کتب لکھنے میں پیش پیش ہے مگر بدقسمتی سے ان میں سے اکثر نہ تو باقاعدہ طور پر او لیول کے طلباء کو پڑھا رہے ہیں اور نہ ہی کیمبرج یونیورسٹی کی امتحانی ضروریات سے آگاہ ہیں۔ نتیجتاً بازار میں دستیاب کتب جہاں طلباء کے لئے مکمل تفہیم کا وسیلہ نہیں بن رہیں وہیں امتحانی ضروریات کے لیے بھی ناکافی ہیں۔

قابل افسوس امر یہ ہے کہ سوائے ایک آدھ کے کسی مصنف نے نصاب میں شامل افسانوں، مضامین اور شاعری کا تجزیہ پیش نہیں کیا جو کہ امتحانی حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ علاوہ ازیں تنقیدی اقتباس جو پرچہ دوم میں امتحان برائے 16-2015ء کے لئے شامل کیا گیا ہے اس کی مشق میں دستیاب کتب بھی میسر نہیں ہیں۔ زیادہ تر دوستوں نے شاعری اور نثر پر اپنی مرضی سے ایک سوالنامہ بنا کر پیش کر دیا ہے جس کا کیمبرج یونیورسٹی کے امتحان سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ مزید براں دستیاب کتب کل ملا کے 30 فیصد امتحانی ضروریات سے متعلقہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں نصاب میں شامل اصنافِ ادب کی وضاحت، تجزیہ وتشریح طلباء کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی گئی ہے اس سلسلے میں کسی علمیت کے اظہار کی بجائے سادہ اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے تا کہ طلباء کسی الجھاؤ کا شکار ہوئے بغیر اصنافِ ادب کی تفہیم کر سکیں۔

بقول غالب:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

امید ہے میری یہ کاوش جہاں اولیول کے طلباء کی امتحانی ضروریات کی تکمیل کرے گی وہاں ادب کے عام قاری اور اساتذہ بھی اس سے مستفید ہو پائیں گے۔آپ کی قیمتی آراء میرے تنقیدی ذوق کو جلا بخشیں گی۔

ڈاکٹر سید ندیم جعفر
ایچیسن کالج، لاہور
31 اکتوبر 2014

افسانہ.....تعارف

مختصر افسانہ اردو ادب میں مغرب سے آیا۔ آغاز میں سید سجاد حیدر یلدرم نے ترکی کی کچھ کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور کچھ طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ یہی اس صنف کے امکانات کی رونمائی تھی۔ اس کے بعد پریم چند نے اسی صنف کو یوں اپنایا کہ ایسے لگنے لگا کہ افسانہ بنا ہی پریم چند کے لیے ہے۔ آغاز میں پریم چند نے شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانیاں لکھیں لیکن بعد میں اس کے افسانوں کا موضوع خالص عوامی زندگی بنا۔ پریم چند نے زندگی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور افسانوں میں زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی۔ شہری زندگی ہو یا دیہاتی پریم چند کا فن ہمیں عروج پر نظر آتا ہے۔ بقول سید عابد علی عابد:

''پریم چند کو زندگی میں ہنستے بولتے نوجوان اور پتی برتا عورتوں کی باتوں میں جلوہ گری نظر آئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکن کائنات کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔''

پریم چند کے بعد سب سے بڑا نام منٹو کا ہے۔ منٹو نے افسانے میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پردے کے اندر جھانک کر دیکھا اور من وعن قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔

افسانے کی کوئی جامع تعریف نہیں کی گئی جس تعریف پر اکثر نقاد متفق ہیں وہ یہ ہے کہ افسانہ ایک ایسی مختصر کہانی کا نام ہے جسے ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھا جا سکے جس کے کردار مرکزی دائرے کے گرد گھومتے ہیں جس کا مطلب وحدتِ تاثر ہے۔ افسانے میں پڑھنے والے کو توجہ ہٹانے کی اجازت نہیں ہوتی تمام خبریں، تمام اعمال، افسانے کے تمام کردار ایک محور پر گھوم جاتے ہیں اور پڑھنے والے کی توجہ برابر اس پر مرکوز ہوتی ہے۔

افسانہ نگار کا یہ فرض ہے کہ وہ اختصار سے کام لیتے ہوئے فوراً اپنے مرکزی تاثر کی طرف اشارہ کرے اور قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلے۔ افسانے کے ابتدائی جملے اتنے جاذبِ توجہ ہونے چاہئیں کہ پڑھنے والا کہانی کے اندر گھستا چلا جائے۔ افسانے کے ثانوی کردار مرکزی کردار کے حوالے سے دلچسپی کے عنصر کو قائم رکھتے ہیں۔ غزل کی طرح افسانے میں بھی مصنف، لفظوں کا استعمال، جملے کی بنت، خیالات کے محور اور کرداروں کی تقسیم میں بڑی احتیاط سے کام لیتا ہے اور یہ سب چیزیں ایک مرکز کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ وحدتِ تاثر کے حوالے سے افسانے کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ جیسے:

''ٹھہرے پانی میں پتھر پھینکا جائے تو پتھر کی ضرب سے پیدا ہونے والی لہریں گولائی میں پھیلتی

ہوئی تالاب کے کناروں تک جاتی ہیں مگران کا مرکز وہی جگہ ہوتی ہے جہاں پتھر پھینکا جائے۔''

اس طرح افسانہ بھی کسی ایک مرکزی نقطے پر انحصار کرتا ہے اور باقی تمام عوامل اس نقطے کو نمایاں کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ ناول اور افسانے میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ناول میں اور کہانیاں بھی مل جاتی ہیں جبکہ افسانہ نگار کہانی کو اپنے مدعا پر مرکزی نقطے کی طرف کہانی کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ پلاٹ' کہانی' کردار' مناظر' مکالمے ناول اور افسانے میں مشترک ہیں۔ صرف وحدتِ تاثر ایسا عنصر ہے جو افسانے کو ناول سے جدا کرتا ہے اور اسی وجہ سے افسانہ عوام میں مقبولیت بھی حاصل کرتا ہے۔

افسانے کی صنف نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی بقول عابد علی عابؔد:

''اردو میں مختصر افسانہ سیلاب کی طرح آیا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ناولوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا۔''

افسانے کے اجزائے ترکیبی:

کہانی:

جس موضوع پر بھی افسانہ لکھا جارہا ہو ضروری ہے وہ دلچسپ ہو اور قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائے۔ افسانے کی کہانی مختصر ہوتی ہے اور بہت تیزی سے اپنے مرکزی نقطے کی طرف بڑھتی ہے۔ کہانی جتنی حقیقت کے قریب ہوگی اتنا ہی افسانہ کامیاب ہوگا۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو موضوعات خالص عوامی زندگی سے لیے جائیں وہی عوام میں مقبول ہوتے ہیں۔

پلاٹ:

ناول کا پلاٹ جتنا پیچ دار ہو' پھیلا ہوا ہو وہ ناول کو خوبصورت بناتا ہے۔ اس کے برعکس افسانے کا پلاٹ پھیلنے کے بجائے اپنے مرکز کی طرف سمٹتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے افسانے کا پلاٹ ناول کی نسبت سیدھا سادہ ہونا ضروری ہے۔ ناول میں ایک ہی وقت میں کئی کہانیاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں جب کہ افسانے کا پلاٹ اپنے محور کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرواتا ہے۔ پلاٹ جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی افسانہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

کردار:

افسانے کے کردار اپنے مرکزی کردار کی معاونت کرتے ہیں اکثر اوقات ایک کردار ایسا ہوتا ہے جس پر موضوع کا انحصار ہوتا ہے۔ باقی تمام کردار مرکزی کردار کے مددگار اور کہانی کو سمیٹتے ہوئے مقصد کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں۔ افسانے کے کردار عومی ہوتے ہیں اور وہ ہمیں اپنے گرد و پیش میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق حقیقی زندگی سے ہوتا ہے۔ کردار جتنا زندگی کے قریب ہوگا اتنا ہی مضبوط ہوگا۔

وحدتِ تاثر:

جس طرح پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ افسانے کا ایک حساس موضوع ہوتا ہے اور مصنف قاری کو اس کی طرف لے کر بڑھتا ہے۔ افسانے کے کردار' کہانی' پلاٹ' مکالمے' سب اسی مرکزی نقطے یا محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ افسانے کے آغاز میں مصنف دلچسپی کا ایک عنصر دکھا کر بہت تیزی سے اپنے قاری کی توجہ اس محور پر مبذول کرواتا ہے جو افسانہ لکھنے کا باعث بنا۔ وحدتِ تاثر افسانے کی خوبی ہے۔ اسی وجہ سے افسانہ دنیا کی سب سے زیادہ دلچسپ صنفِ ادب کے طور پر سامنے آیا ہے۔

اختصار:

اختصار بھی افسانے کی ایک خوبی ہے۔ افسانے کی تعریف میں یہ کہا جاتا ہے کہ افسانہ ایسی کہانی کو کہتے ہیں جو ایک ہی نشست میں بیٹھ کر پڑھی جا سکے۔ اختصار افسانے کی بنیادی ضرورت ہے۔ عہدِ حاضر میں زندگی اس قدر مصروف ہے کہ ناول پڑھنے کے لیے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے' اس لیے افسانہ عصرِ حاضر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی صنفِ ادب ہے۔ اختصار ہی کی بنیاد پر افسانے کو یہ دوام حاصل ہوتا ہے۔

افسانے

منشی پریم چند

پیدائش: 31 جولائی 1880ء ضلع بنارس۔ وفات: 8 اکتوبر 1936ء بنارس۔

پریم چند افسانوی ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی کہانیوں کے ترجمے اور کچھ طبع زاد کہانیاں لکھ کر اردو افسانے کا آغاز کیا۔ پریم چند نے اس صنف کو ایسا اپنایا کہ گویا افسانہ بنا ہی پریم چند کے لیے تھا۔ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ مگر اپنے قلمی نام ''پریم چند'' سے ادبی دنیا میں اپنے آپ کو متعارف کروایا۔

پریم چند گھریلو اعتبار سے تنگدستی اور عسرت کا شکار تھے۔ ان کے والد ڈاکخانے کے محکمے میں معمولی ملازمت کرتے تھے۔ دھنپت رائے نے بمشکل تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپنے اصل نام سے لکھنے سے گریز کیا۔ پریم چند نے اردو افسانے کو وہ دوام بخشا کہ افسانوی ادب کی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ایسے وقت میں شاہکار افسانے تخلیق کیے جب ان کے سامنے قابلِ ذکر افسانوں کے نمونے موجود نہ تھے۔ آغاز میں پریم چند ماضی کی طرف دیکھتے نظر آتے ہیں۔ بقول عابد علی عابدؔ

''شروع میں.....راجپوت شہزادوں کی عصمت شعاری، شہزادوں کی دلاوری.....
ہندوستان کی نوک پلک.....اس کے افسانوں کے لیے موضوع مہیا کرتی رہی۔''

پھر وہ زندگی کے قریب تر آیا۔ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا جن مسائل سے تعرض کرنا لوگ کسرِ شان سمجھتے تھے انہیں اس نے افسانے کا موضوع بنایا اور یوں پریم چند کو زندگی ہنستے بولتے نوجوانوں اور پتی برتا عورتوں کی باتوں میں جلوہ گر نظر آئی۔ بقول سیّد عابد علی عابدؔ:

''پریم چند کے افسانے اس کی زندگی میں ہی ادب کی کلاسیکی میراث بن گئے.....اور یوں محسوس
ہونے لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن کائنات کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔''

پریم چند کا قلم زود نویس تھا۔ وہ ادبی جریدہ ''زمانہ'' اور ہفت روزہ ''آوازِ خلق'' میں نواب رائے کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 1909ء میں شائع ہوا جسے انگریزی حکومت نے بغاوت کا نام دے کر ضبط کر کے جلا ڈالا۔ مگر

پریم چند چاہتے ہوئے بھی قلم کی روانی کو دبا نہ سکے اور ان کا ادبی سفر جاری رہا۔ان کی تحریروں میں ''بوڑھی کاکی''، ''جج اکبر'' اور ''ایمان کا فیصلہ'' خاصے کی چیزیں ہیں۔ پریم چند نے چھتیس سالہ تخلیقی سفر میں 13 ناول، بے شمار افسانے اور کئی متفرق مضامین لکھے۔ان کے ناولوں میں ''میدانِ عمل''، ''گئو دان''، ''چوگانِ ہستی'' مشہور ہیں جبکہ لاتعداد افسانے ان کی پہچان بنے۔ان کے افسانے دو بیل میں اصل کردار جانور ہیں جبکہ انسان پس منظر میں موجود ہیں۔اس کے علاوہ ان کا افسانہ ''گوری ہو گوری'' ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

پریم چند نے عصری تقاضوں اور رویوں کو بھی اپنا موضوع بنایا۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے زندگی کی حقیقی تصویر ہمارے سامنے پیش کی۔ پریم چند کے کردار چلتے پھرتے انسان ہیں۔حقیقت نگاری ان کے افسانوں کا خاصا ہے اور یوں افسانوی ادب میں ایک نئی طرح ڈالی۔ ''کفن'' معاشرتی زوال کی ایسی کہانی ہے جسے پریم چند نے حقیقی انداز میں پیش کر کے اس عہد کی ترجمانی پیش کی ہے۔ ''عیدگاہ'' ان کے شاہکار افسانوں میں شامل ہے جس میں استحصال زدہ معاشرے کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔

عیدگاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّے کی طرح پُرتبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو' کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کُرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جارہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہوگئے ہیں' اسے تیل اور پانی سے نرم کررہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہوجائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سیکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا' وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیویوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انہیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں۔ ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جارہے ہیں؟ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہوکر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل۔

اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہوگیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مرگئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے۔ کہتی کس سے' کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی' سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیاہ ہوگیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن' آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا میں مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے' اس کی ایک نگاہِ معصوم

اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔ ''تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔'' لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سیویاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا' کیا اس وقت سیویاں پکانے بیٹھے گی؟ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہمین کے کپڑے سیئے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے' لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے' حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے گا۔ دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی۔ سب کو سیویاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے۔ یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچوں کے ساتھ تھا۔ سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں؟

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو خواب الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے، یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے' اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر؟ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کودن' نجی کام سے جی چرانے والے' یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں کیا اب تک پڑھتے ہوتے؟ وہ کلب گھر ہے وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے۔ ''بیٹ'' تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا۔ ''ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگیں۔ اللہ قسم!''

حامد نے اس سے اختلاف کیا ''چلو' منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگیں گے۔ سیکڑوں

گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے۔''

محسن۔''لیکن دوڑتی تو نہیں، اچھل کود نہیں سکتیں۔''

حامد۔''کام آ پڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تو دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔''

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔

اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا۔ ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے رات کو ایک جن ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے۔ بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپے جنّات کو کہاں سے مل جائیں گے۔

محسن۔''جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب، آپ ہیں کس خیال میں، ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔''

حامد۔''جنّات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔''

محسن۔''اور کیا ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔''

سمیع۔''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا۔ مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انہیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔''

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر انہیں روپے دے جاتے ہیں۔

آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ لیپ، پھام پھو۔

نوری نے تصحیح کی۔ یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تو انہیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں اور دوسرے محلّہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں۔''

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ''ارے احمق انہیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا' ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے نیچے سوئے اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔''

بستی گھنی ہونے لگی۔ عیدگاہ جانے والوں کے مجمعے نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر' چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگن صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے' تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی' محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی' جماعت شروع ہوگئی ہے اور املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رُتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں' ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہورہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہوجائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُراحترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کردیتی ہے۔ گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

نماز ختم ہوگئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کررہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہوگئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے' ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے۔ کبھی زمین پر گرتے ہیں۔ یہ چرخی ہے' لکڑی کے گھوڑے' اونٹ' ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ آذر اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کرسکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا ہے۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں' عُسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنادیا ہے۔ سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہوجاتا ہے' خاکی وردی اور پگڑی لال' کندھے پر بندوق' معلوم ہوتا ہے' ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر

مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسّی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن' اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر' ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چُور چُور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا' کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ ''میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام۔''

محمود۔ ''اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔''

نوری۔ ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔''

سمیع۔ ''اور میری دھوبن روز کپڑے دھوئے گی۔''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے ہی تو ہیں' گریں تو چکنا چُور ہو جائیں۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے' طرح طرح کی ضروری چیزیں' ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند' سیٹیاں' بگل' بھنورے' ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے' محمود گیند' نوری ربڑ کا بُت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری۔ اسے وہ بجا بجا کر گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں' کسی نے گلاب جامن' کسی نے سوہن حلوہ' مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دور سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نوری اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔ محسن نے کہا۔

''اچھا اب ضرور دیں گے یہ لے جاؤ اللہ قسم!''

حامد نے کہا۔ ''رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا۔ ''تین ہی پیسے تو ہیں۔ کیا کیا لو گے؟''

محمود۔ ''تم اس سے مت بولو حامد' میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو۔''

حامد۔ ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''

محسن۔ ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔''

محمود۔ ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید لے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی' پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی' گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ' مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اتار لو' چولہے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے' بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں۔ سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھلواؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا' کھائیں مٹھائیاں آپ منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں' میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں' مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی' پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کُرتے دلوا دوں گا' اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگیں۔

دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا ''یہ دست پناہ بیچو گے؟''

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ ''وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

''تو بتلاتے کیوں نہیں کتنے پیسے کا دو گے؟''

''چھ پیسے لگے گا۔''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ ''تین پیسے لو گے؟'' اور آگے بڑھا تا کہ دکاندار کی گُھرکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گُھرکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا' گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ دست پناہ لایا ہے احمق اسے کیا کرو گے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو۔ ساری پسلیاں چُور چُور ہو جائیں گی بچا کی۔''

محمود۔ ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد۔ ''کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا' ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا' چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں' ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔''

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ ''میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے۔''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلّی لگا دی۔ ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں' پانی میں' آندھی میں' طوفان میں' برابر ڈٹا رہے گا۔''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے' حامد ہے بڑا ہوشیار۔ اب دو فریق ہو گئے۔ محمود' محسن اور نوری ایک طرف' حامد یکہ و تنہا۔ دوسری طرف سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف ہو جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق۔ ایک طرف مٹی' ربڑ اور لکڑی کی چیزیں۔ دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ رُوئیں تن ہے یہ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر' یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ ''اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔'' حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ ''یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے' مٹکے

اور کونڈے بھرلو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہوگیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔''بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولیے جناب۔''

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا۔''یہ سپاہی بندوق والا۔''

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔''یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑلیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہوجائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مرجائے گی' پکڑیں گے کیا بے چارے۔''

محسن نے تازہ دم ہوکر وار کیا۔''تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلا کرے گا۔''

حامد کے پاس جواب تیار تھا۔''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کرسکتا ہے۔''

نوری نے انتہائی جدت سے کام لیا۔''تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔'' اس جملہ نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ ''دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔''

حامد نے دھاندلی کی۔''میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔''

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا' گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند' سیٹی اور بت ریزرو تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے۔ دست پناہ رستمِ ہند ہے۔ اس میں کسی کو چُوں و چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا مزاج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا۔''ذرا اپنا چمٹا دو' ہم بھی دیکھیں' تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو۔'' حامد:''ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محمود' محسن' نوری اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں' مگر ان کھلونوں کے لیے انہیں دعا کون دے گا؟ کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق

پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب تو دست پناہ تو ہے ہی سب کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے۔ حامد کو خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آ رہے اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پُڑا رکھا گیا۔ پُڑے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالمِ بالا پہ جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالمِ بالا سے دنیائے فانی میں آ رہے اور ان کے مجسمۂ خاکی کے پرزے ہوئے۔ پھر بڑے زور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی تاکہ بےکار نہ جا کر زاغ وزغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا۔ اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے ''چھونے والے داگتے لہو'' پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آ رہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آناً فاناً میں جوڑ دے گا' صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے' ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے' ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملی جراحی ناکام ہو جاتی ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا' نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

''یہ دست پناہ کہاں ملا بیٹا؟''

''میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ ''یہ کیسا بےسمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی۔''

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ ''تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔''

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو منہ سے بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں

میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زباں شفقت تھی۔ دردِ التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اُف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جانسوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے، اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا۔ کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

''عیدگاہ''......تجزیاتی نوٹ

پریم چند اردو کے مایہ ناز افسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں۔ پریم چند نے اس صنفِ ادب کو ایسے اپنایا گویا افسانہ بنا ہی پریم چند کے لیے تھا۔ پریم چند نے ناول بھی لکھے اور افسانے بھی۔ ان کی تحریروں کا محور غریب، نادار اور معاشرتی طور پر پسا ہوا طبقہ ہے۔ وہ ناول لکھ رہے ہوں یا افسانہ اپنے اس محور سے دور نہیں جاتے۔ آسائشات سے محروم اور زندگی سے جنگ لڑنے والے لوگ ہی پریم چند کی توجہ کا مرکز ہیں۔

ہمارے نصاب میں شامل افسانہ ''عیدگاہ'' پریم چند کا ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا نمائندہ افسانہ ہے۔ کہانی میں پریم چند نے عید کی آمد، تیاری، عیدگاہ کا منظر اور عید کے میلوں ٹھیلوں کا ذکر کیا ہے۔ افسانے کا کینوس اپنے موضوع کی مناسبت سے بہت وسیع ہے مگر کہانی بنیادی طور پر حامد اور اُس کے چار دوستوں (محمود، محسن، سمیع اور نوری) کے گرد گھومتی ہے۔ افسانے کا کوئی بھی حصہ اٹھا کر دیکھیں تو پریم چند کے مشاہدے، تجربے اور زبان کی سادگی کی داد دینی پڑتی ہے۔

پریم چند سادہ مگر دل دہلا دینے والے جملوں سے کہانی میں جان ڈال دیتے ہیں جیسے حامد کی ماں کی بیماری اور موت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ''دل پر جو گزرتی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہوگئی۔''

اسی طرح حامد کی دادی کے پاس بچی ہوئی اٹھنی (آٹھ آنے) کا ذکر یوں کرتے ہیں ''اُسی اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی ہے۔''

پریم چند نے کہانی میں حامد اور اُس کے دوستوں کی گفتگو سے جو بچوں کی نفسیات بیان کی ہے وہ صرف پریم چند ہی کا خاصا ہے۔ عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں آموں کے باغ، کلب گھر، کالج اور میموں (Madams) کے حوالے سے جو بچوں کی گفتگو پیش کی ہے وہ بچوں کی نفسیات اور بلاغت کی معراج ہے۔ بچوں کا اشیاء، افراد اور مظاہر کے بارے میں باتیں کرنا پھر اُن سے حتمی نتائج اخذ کرنا اور اپنے معصوم جذبات واحساسات کا اظہار کرنا پریم چند کے بچوں کی نفسیات پر عبور اور مشاہدے کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ بچوں کی گفتگو ہو مافوق الفطرت عناصر کا ذکر نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔ پریم چند نے جنات کے حوالے سے بچوں کے نظریات وخیالات کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

افسانے میں جہاں پریم چند بچوں کی زبان سے پولیس کے کالے کرتوت اور رشوت ستانی کو بیان کرتے ہیں تو پڑھنے

والا سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ کیا بچے اتنی پختہ گفتگو کر سکتے ہیں مگر اس میں یہ پہلو پریم چند کے حق میں جاتا ہے کہ بچے بڑوں کی باتیں سن کر نتائج اخذ کرتے ہیں۔

عید گاہ میں نمازیوں کی تنظیم، صفوں اور جماعت کا احوال بھی پریم چند کی افسانوی مہارت اور مشاہدے کی دلیل ہے۔ عید کی نماز کا پرکیف منظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔''

نماز کے علاوہ عید کے میلے میں لگے پنگھوڑوں اور مٹھائی کی دکانوں، حامد کے دوستوں کی ان چیزوں میں دلچسپی اور خریداری اور حامد کے احساسِ محرومی کو پریم چند نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ حامد کے پاس صرف تین پیسے ہیں اور اُس کے دوستوں کے پاس زیادہ۔ اس صورت حال میں وہ زیادہ اشیاء خریدتے ہیں مگر حامد ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ اس کشمکش کو پریم چند نے بڑے حزنیہ انداز میں پیش کیا ہے اور پڑھنے والے کے دل میں وہی جذبات ابھرتے ہیں جو مصنف ابھارنا چاہتا ہے۔

کھلونوں کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند اتنی باریک بینی سے کام لیتے ہیں کہ ہمیں محسن کا بہشتی، محمود کا سپاہی، نوری کا وکیل اور سمیع کی خنجری اپنی آنکھوں کے سامنے یوں نظر آتی ہے جیسے ہم ان کو ہاتھوں سے چھو رہے ہوں۔ پھر ان کھلونوں پر ان بچوں کا مباحثہ اور ایک دوسرے پر برتری لے جانا اور ایک دوسرے کو مات دینا یہ سب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کھلونوں کے موضوع پر کوئی باقاعدہ مباحثہ ہو رہا ہو۔ اس ساری صورتحال میں بچوں کی نفسیات کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور کھلونوں کے استعمال اور ان کے شکست و ریخت' یہ سب پریم چند کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کہانی میں سب سے اہم موڑ اُس وقت آتا ہے جب حامد سب چیزوں کو چھوڑ کر اپنی دادی کے لیے لوہے کا دست پناہ (چمٹا) خرید لیتا ہے تاکہ روٹیاں بناتے ہوئے اُس کے ہاتھ نہ جلیں۔ حامد کے اس فیصلے سے قاری چونک جاتا ہے مگر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ غربت اور محرومی انسان کو وقت سے پہلے جوان اور سنجیدہ کر دیتی ہے۔ یہ غربت بچوں سے ان کا بچپنا اور معصومیت چھین لیتی ہے۔ بھرے میلے میں ایک بچے کا کھانے پینے، کھیلنے اور دیگر من پسند اشیاء کو ترک کر کے ایک لوہے کا دست پناہ خرید لینا جب کہ اُس کے دیگر ساتھی مٹھائیوں، پنگھوڑوں اور کھلونوں سے محظوظ ہو رہے ہوں ایک ایسا عمل ہے جو ہم سب کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے اور دل بے ساختہ یہ پکار اٹھتا ہے کہ

افلاس نے بچوں کو بھی تہذیب سکھا دی
سہمے ہوئے بیٹھے ہیں شرارت نہیں کرتے

یا پھر

ہوٹل کی میز صاف کرتے سوچتا ہوا
بچہ ہے گر تو اس کا جواں کس نے کر دیا

حامد کا یہ عمل ایک بچے کا عمل نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کا ایک المیہ ہے کہ غربت، افلاس اور محرومیاں انسان سے تمام خوشیاں چھین لیتی ہیں اور جب ضروریاتِ زندگی انسان کی پہنچ سے دور ہو جائیں تو پھر وہ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔

فرہنگ......عیدگاہ

ہریاول: سبزہ
ہیضہ: پیچش اور قے کی بیماری
بساط: طاقت، ہمت
تہوار: مذہبی یا روائتی طور پر اہم دن
کودن: احمق، بے وقوف
میمیں: انگریز عورتیں (madams)
کوتاہ فہمی: کم عقلی، بے وقوفی
زرق برق: بھڑکیلا لباس
جاجم: فرش پر بچھانے والا پھولدار کپڑا
وجدانی: مستی، جنون
باہم: مل جل کر
ہنڈولا: پنگھوڑا
چہل پہل: رونق
قارون: حضرت موسیٰ کے چچازاد بھائی کا نام جو بہت امیر مگر کنجوس تھا، جس کو خدا نے اس کے خزانے سمیت غرق کر دیا۔ یہ واقعہ قرآنِ پاک میں شامل ہے
نذر: نیاز، تحفہ

فرلانگ: میل کا 1/8 حصہ
جھک مارنا: غلط بات کرنا، بے کار کا کام
مواضعات: موضع کی جمع، گاؤں
دہکان: کسان
یورش: حملہ کرنا، دھاوا بولنا
طفلانہ: بچکانہ
عسرت: غربت، غریبی
اچکن: شیروانی
مصرف: استعمال
بساطی: منیاری لگانے والا، چھوٹی چیزیں بیچنے والا
حریص: لالچی
گلٹ: ملمع کے زیور پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھانا
سبیل: کوئی طریقہ، راستہ، حل
یک وتنہا: اکیلا
اوسان خطا ہونا: گھبرا جانا
دفعیہ: تدبیر

کہرام: شور، زور سے رونا
جلوہ افروز: نمودار ہونا، بیٹھنا
پارسی: آتش پرست، آگ پوجنے والے
مضروب: زخمی
ٹٹی کی آڑ میں شکار: چھپ کر کام کرنا
نفس کشی: خواہشات کو روکنا، کنٹرول کرنا
ذکی الحس: حساس، تیز طرار
جرح: بحث
فیاض: سخی
درگاہ: دربار، آستانہ
جارحانہ عمل: سخت کاروائی
کمک: امداد
مجسمہ خاکی: مٹی کا انسان
عالم جاودانی: ہمیشہ رہنے والا، دنیا، اگلا جہان
زاغ وزغن: کوے اور چیلیں
خطاوار: گناہ گار، مجرم

احمد ندیم قاسمی

(1916ء—2006ء)

اصل نام احمد شاہ ہے۔ احمد ندیم قاسمی ادبی نام ہے۔ انگہ تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پیر غلام نبی اپنی عبادت اور زہد وتقویٰ کی وجہ سے اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے۔ ندیم قاسمی نے ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ 1923ء میں والد کی وفات کے بعد اپنے چچا حیدر شاہ کے پاس کمیل پور چلے گئے۔ جہاں ان کو علمی، ادبی ماحول میسر آیا۔ 1931ء میں میٹرک کیا اور بہاولپور کالج میں داخل ہو گئے۔ 1935ء میں بی-اے کیا اور 1939ء میں آب پاشی میں ملازم ہو گئے۔ تین سال بعد نوکری سے استعفیٰ دے کر لاہور آ گئے۔ یہاں ''تہذیبِ نسواں'' اور ''پھول'' کی ادارت سنبھالی اور 1943ء میں ادبِ لطیف کے مدیر مقرر ہوئے۔ تقسیم پاکستان کے بعد ڈیڑھ سال تک ریڈیو پشاور سے منسلک رہے۔ پھر حاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ''نقوش'' کی ادارت سنبھالی۔ امروز اخبار سے بھی وابستہ رہے اور حرف و حکایت والا کالم عنقا کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ ان کی ادارت میں معروف ادبی مجلّہ ''فنون'' ایک طویل عرصے تک شائع ہوتا رہا اور پرچے نے ادبی دنیا میں اپنا ایک ایسا مقام بنایا کہ اس میں لکھنا ادیبوں اور شاعروں کے لیے پہچان کا باعث بننے لگا۔

احمد ندیم قاسمی نامور شاعر، معروف کالم نگار اور برصغیر کے مانے ہوئے افسانہ نگار شمار کیے جاتے ہیں۔ احمد ندیم سیاسی اور سماجی تحریکات سے وابستہ رہے اور ترقی پسند تحریک کا حصہ بھی رہے اس لیے ان کے ہاں طبقاتی تضاد اور معاشرتی ناہمواریوں کے خلاف ایک شدید ردِعمل اور احتجاج ملتا ہے۔ شاعری ہو یا دیگر تخلیقات ان کے ہاں ترقی پسند افکار نظر آتے ہیں۔ وہ پوری انسانیت کے دکھ درد میں شریک نظر آتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی گاؤں میں پیدا ہوئے اور وہ دیہاتی زندگی سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں دیہاتی زندگی تمام لوازمات کے ساتھ اپنے جوبن میں نظر آتی ہے۔ وہ پسے ہوئے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے دیہات کو گہری نظر سے دیکھا اور انہیں اس دیہاتی زندگی سے گہری واقفیت ہے۔

ندیم قاسمی کے ہاں پریم چند کی طرح دیہات کا ماحول، پیار، محبت، خلوص اور تمام جذبے سچائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

قاسمی نے صرف دیہات کی زندگی پر ہی نہیں لکھا بلکہ ان کا قلم شہری زندگی کے مناظر دکھانے میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ یہاں کی زندگی کی بناوٹ ظاہر داری اور مشینی زندگی کا ذکر بھی ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان کا افسانہ ''گھر سے گھر تک'' اس کی

ایک زندہ مثال ہے۔ ہمارے نصاب میں شامل ان کا افسانہ ''جوتا'' گاؤں کے رہنے والوں کے مسائل کو ہمارے سامنے لاتا ہے اور وڈیرے اور کمی کے درمیان طبقاتی تضاد کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتا ہے۔ قاسمی صاحب نے 90 برس کی طویل عمر پائی اور 2006ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''کپاس کا پھول''، ''سناٹا''، ''آس پاس''، ''درودیوار'' اور ''گھر سے گھر تک'' شامل ہیں۔

جوتا

کرموں ایک قوال پارٹی میں برسوں تک تالی بجا بجا کر تال دیتا رہا۔ پھر آواز لگانا بھی سیکھ گیا۔ پیچھے سے آگے آ گیا اور بڑے قوال کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب بڑے قوال کو تشویش لاحق ہوگئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ نکل جائے۔ چنانچہ اس نے کرموں کو چلتا کر دیا۔ کرموں کی آواز تو واجبی سی تھی مگر اس نے قوالی کے گُر سیکھ لیے تھے اور ہارمونیم کی آواز میں اپنی آواز چھپا لینے کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنی قوال پارٹی بنالی اور عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ کے جمگھٹوں میں گاتا رہا اور اپنے تینوں بچوں کو پڑھاتا رہا۔ دراصل بڑے قوال کے ساتھ اسے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے بچوں کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بجاتے یا قوالوں کے پیچھے بیٹھے تالیاں پیٹتے پھریں گے اور اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ان کی باچھیں ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے سکول میں داخل کرایا تھا تو سارا گاؤں جیسے سناٹے میں آ گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے حضرت آدم کے آسمان سے زمین پر اترنے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پہلا میراثی ہے جسے اپنے بچوں کو تعلیم دینے کی سوجھی ہے۔ چودھری نے اسے دارے پر بلایا اور ڈانٹا۔ ''شرم کرو کرموں۔ میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں ان سے لوگ ڈھول شہنائی کے بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں نام مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟''

کرموں یہ سب سنتا رہا اور چپ رہا البتہ مسکراتا رہا۔ چودھری کی اس ڈانٹ پر کہ اب کچھ بکو بھی، اس نے کچھ کہا تو بس اتنا کہ.....''اقبال قائم! عمر بھر دال ساگ کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ بٹیر کا سالن چکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔''

کرموں نے قوالی کے نام پر چیخیں اور بڑھکیں مار مار کر پیسہ جمع کیا اور بچوں کو یوں پڑھایا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ نہ جانے کیا پٹی پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے ہونے سے شرماتے بھی نہیں تھے۔ کہتے تھے ''ٹھیک ہے، ہم کرموں میراثی کے بیٹے ہیں مگر چودھری کی طرح ہماری پیڑھی بھی تو حضرت آدم ہی سے ملتی ہے۔''

پھر یہ لڑکے اُدھر لاہور، کالا شاہ کاکو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہو گئے اور باپ کو ہر مہینے اتنا بہت سارا روپیہ بھیجنے لگے کہ کرموں اپنی قوال پارٹی توڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگا اور صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چودھری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا.....''حرام کی اولاد'' اس نے کہا ''اتھلا کمینہ کہیں کا۔ دیکھ لینا لوگو! سال دو سال میں خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہوگا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آ گئی تو۔ ایک میراثی

جب زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو سورج سوا نیزے پر اترنے کو ہے۔'' اور چودھری پھر یوں ہنسنے لگا جیسے رونے لگا ہے۔

کسی نے کرموں کو چودھری کی یہ بات بتائی تو وہ بولا ''چودھری کیوں خفا ہو رہا ہے۔ میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر ابھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا۔ آہستہ آہستہ حقدار ہو جائے گا' زمانہ بدل رہا ہے۔''

جن لوگوں نے کرموں کو چودھری کی بات بتائی تھی' انہوں نے چودھری کو کرموں کی بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چودھری شربت پی رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے اچھو ہو گیا اور شربت اس کی ناک سے بہنے لگا۔

پھر ایک روز کرموں گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ ہانک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا ''میں میراثی ہوں۔ پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں' اس لیے جی چاہتا ہے۔ یہاں گلی میں بیٹھنے کے بجائے ایک پکی بیٹھک بنوا لوں۔ اس میں پلنگ اور مونڈھے بچھا دوں اور تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہاں کی اچھی اچھی' پیاری پیاری' میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے کے لیے چودھری کا دارا تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بل کھڑا ہوں۔''

یہ بات کر کے وہ اپنے گھر گیا۔ حقہ تازہ کیا۔ چلم پر آگ سجائی اور کش لگانے کے لیے چارپائی پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چودھری کی طرف سے اسے بلاوا آ گیا۔ اس نے دارے پر قدم رکھا ہی تھا کہ تین چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرا دیا اور چودھری کا پلا ہوا منشی اس کی پیٹھ پر جوتے برسانے لگا۔ ساتھ ساتھ چودھری اسے گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا ''بیٹھک بنائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح؟ چار پیسے کیا آ گئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔ لگاؤ اور لگاؤ۔''

کرموں کو اتنے جوتے لگے کہ کسی اور کو لگتے تو وہ گنتی بھول جاتا مگر کرموں گنتا رہا..... ''میں تو گنتا رہا'' اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔ ''میں تو گنتا رہا تا کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے جوتوں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ باسٹھ لگے تھے' باسٹھ پورے کروں گا خدا کے حضور انشاء اللہ۔ ایک کے ستر نہ سہی' چودھری کے لیے تو میرا ایک ہی جوتا بہت ہے سارے جہان کی مخلوق کے سامنے۔''

انہیں دنوں ووٹ درج ہو رہے تھے۔ ووٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آئے اور کرموں کا ووٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا ''بھئی تم اپنا نام کرما بتاتے ہو مگر کرما کیا نام ہوا؟ کرم الٰہی ہو گا یا کرم علی یا کرم دین۔ کرما کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے اصلی نام کا بگاڑ معلوم ہوتا ہے۔''

کرموں بولا ''میں میراثی ہوں جی اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بگاڑ تو کرموں ہے جیسے میرے باپ کو لوگ گاموں کہتے تھے' پر اس کا اصلی نام گاما تھا۔''

زچ ہو کر انہوں نے فہرست میں ''کرما ولد گاما ذات میراثی پیشہ گداگری'' کے الفاظ لکھے تو کرموں بگڑ گیا۔ ''نہیں صاحب جی' میں گداگر نہیں ہوں۔ گداگری کا ایک پیسہ بھی میرے پر حرام ہے۔ میں تو عمر بھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے بچے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلہ چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گداگر کیسے ہو گیا؟ گداگری اتنی سستی ہے تو چودھری کو گداگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔''

چودھری کو خبر ملی کہ کرموں نے ووٹ درج کرانے والوں کے سامنے اسے گداگر کہا ہے۔ اسے فوراً دارے پر بلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی سے اسے جوتے لگوائے۔ جوتے لگ رہے تھے۔ جب کرموں اچانک اٹھ بیٹھا اور منشی کی کلائی پکڑ کر بولا۔ ''بس باسٹھ پورے ہو گئے۔ میرا کوٹہ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہوگی۔''

''مجھے تکلیف ہوگی؟'' چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پر سورج گر پڑا ہے۔ ''مجھے کیسے تکلیف ہوگی کمینے؟''

کرموں کے تیور بدلے ہوئے تھے، بولا ''چلیے آپ کو تکلیف نہیں ہوگی تو آپ کا حساب پورا کرنے والے فرشتے کو ہوگی۔''

''میرا حساب؟'' چودھری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پلنگ پر ہی کھڑا ہو جائے گا۔ ''کیا بکتے ہو؟ میرا حساب کیسا؟''

''جی یہی، غریبوں کو جوتے لگوانے کا حساب۔ ایک کے ستّر۔'' کرموں مزید جوتوں کا انتظار کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پگڑی اٹھا کر اسے جھاڑ رہا تھا۔ ''اب آپ خود حساب لگا لیجیے۔ اقبال قائم کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ وہ پہلے۔ کل ہوئے خدا آپ کا بھلا کرے، اک سو چوبیس۔ قیامت کے دن اگر ایک کے ستّر لگیں تو ایک سو چوبیس کے کتنے لگیں گے؟ منشی جی حساب لگا کر بتا دو چودھری جی کو۔''

چودھری نے غصے میں اپنے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جب دیکھا کہ دارے پر موجود بیشتر لوگ کرموں کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ واپس لانے کے بجائے اس نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں میں یوں مسلا کہ وہ سفوف بن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہونٹوں پر کپکپاتی رہ گئیں۔

اس وقت پرندے واپس آشیانوں کو جا رہے تھے۔ شام قریب تھی۔

چودھری اس واقعے کے بعد کرموں سے بہت سنبھل کر بات کرنے لگا۔ کرموں میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں جیسے امریکہ روس سے اور روس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم جب چودھری کے دارے پر سے فالتو لوگ اٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی رہ جاتے تو وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا۔ ''اب یہ کمینہ کڑوی گولی کو تھوک دیتا ہے۔ اب میں اسے شکر چڑھی گولیاں کھلاؤں گا۔'' پھر وہ حالات کے طویل تجزیے میں مصروف ہو جاتا۔ ''لوگ کہتے ہیں شراب کا نشہ برا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں نو دولتیوں کے لیے روپے کا نشہ اس سے بھی برا ہے۔ کرموں کو دیکھو، کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ ملتا تھا، اقبال قائم، اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوع میں چلا جاتا تھا اور کہاں یہ دن کہ کل کہنے لگا..... میں اُدھر لاہور، فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہیے تو لیتا آؤں، کوئی چھڑی وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپے کا نشہ ہے۔'' پھر چودھری نے گردن کو کھینچنے کی حد تک کھینچ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا ''کہیں وہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا تو نہیں ہے حرام کی اولاد۔ یاد ہے کہ ایک بار میں یہیں دارے پر اسی کی باتیں کر رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کمینہ بھی ایک طرف بیٹھا ہے۔ میں نے اس نسلی کنگلے کے نئے ٹھاٹھ کی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوا اگر مور کے پر سجا لے تو بھی کوا ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ میری چلمیں بھرنے والا..... میرے اصطبل صاف کرنے والا..... بھرے دارے میں بولا۔ ویسے چودھری جی سیانوں سے سنا ہے کہ مور بھی کوّے کی نسل میں سے ہے۔ صرف رنگ دار پر نکال لیے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا

ہے!..... یاد ہے نا؟ روپے نے اتنے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اس افلاطون کے پٹھے کے ورنہ یہاں میرے سامنے بلی کی طرح منمنا تا پھرتا تھا۔ روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جوتے بھر کی کر دی ہے مگر مجھے ایسے نو دولتیوں کو آپے میں رکھنے کے گُر معلوم ہیں۔ جوتے پر چاہے سنہرا کام ہوا ہو رہے گا تو وہ جوتا ہی اور پاؤں ہی میں پہنا جائے گا۔ اس میراثی کے بچے کو میرے گاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہوگا۔ دیکھ لینا۔''

سردیوں کے دن تھے۔ کرموں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس آیا تو اس نے سنہرے رنگ کا ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ لوگ اس کمبل کو چھوتے تو حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیڑ کی اون اتنی نرم بھی ہو سکتی ہے۔ کرموں کے ایک رشتہ دار نے اس کمبل کو چھوا تو بسم اللہ پڑھ کر کمبل کا کونا منہ میں ڈال لیا اور بولا ''سوجی کا حلوہ ہو تو ایسا کہ جب جی چاہا اوڑھ لیا، جب جی چاہا کھا لیا۔''

خود کرموں ملنے والوں کو بتاتا رہا کہ ''پورے ایک سو کا ہے اور پھر صرف خوبصورت ہی نہیں ہے، اندر سے بھی بڑا گنی ہے۔ باہر برف گر رہی ہو تو کمبل میں انگیٹھی سی دہکتی رہتی ہے..... پوہ کی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے پنجتن پاک کی قسم!''

پوری بستی میں اس کمبل کے چرچے ہونے لگے۔ بات چودھری تک بھی پہنچی مگر یوں کہ کرموں کہہ رہا تھا..... ''ایسا کمبل تو چودھری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا''.....اس پر چودھری یوں مسکرایا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سرا چھری سے چیر دیا ہے۔ کرموں کے رویّے نے چودھری کو سیاستدان بنا دیا تھا۔

ایک دن کرموں یہ کمبل اوڑھ کر چودھری کے دارے کی گلی میں سے گزرا تو چودھری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کرموں کو بلایا، اس کے کمبل پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''کہاں سے مارا؟''

کرموں پاس ہی ایک سِل پر بیٹھ گیا ''میں نے تو.....اقبال قائم.....ساری عمر میں ایک پدا تک نہیں مارا، کمبل کہاں سے ماروں گا اور پھر کمبل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھوا تو میں نے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوتے دیکھے۔''

چودھری کا چہرہ کچھ یوں تن گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ خربوزے میں ایک اور چیر پڑا اور چودھری بولا ''چلو مارا نہیں تو لیا کہاں سے؟''

کرموں نے جواب میں لمحہ بھر دیر کی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتلیوں میں رکھے ہوئے چراغوں کی لویں جل اٹھی ہیں۔ ''کالا شاہ کاکو میں میرا بیٹا ہے نا سرفراز.....''

''ہاں.....وہ سرفا!'' چودھری نے کرموں کی تصحیح کی۔

''جی ہاں، وہی سرفراز۔'' کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ''وہ کہنے لگا کہ بابا، اب کے یہاں سے ایک اچھا سا جوتا لے جاؤ۔ میں نے کہا، بیٹے جوتے اُدھر گاؤں میں بہت ہیں۔ کچھ اور لا دو۔ کوئی تحفہ چیز۔ وہ یہ کمبل لے آیا۔ ملیشیا میں اس کے کسی دوست کا ابا رہتا ہے۔ وہ یہ کمبل اپنے بیٹے کے لیے لایا۔ سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لیے خرید لیا۔''

چودھری بولا ''دیکھو کرموں، اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیے.....تو؟''

''تو لے لیجیے نا اقبال قائم۔'' کرموں نے گرج کر جواب دیا۔ ''سرفراز پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ چور لے گئے۔''

چودھری نے کرموں کی بات زور کے ایک قہقہے میں اڑانے کی کوشش کی مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوکر بولا۔ ''اس کا کیا لوگے؟''

''کچھ بھی نہیں اقبال قائم۔'' کرموں کی آواز میں بڑی آسودگی اور بے نیازی تھی۔

''مگر میں مفت نہیں لوں گا۔'' چودھری بولا۔ ''یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ ہم مفت چیزیں دیتے ہیں' لیتے نہیں۔ تم تو جانتے ہو' تمہیں تو عمر بھر کا تجربہ ہے۔''

''جی ہاں۔'' کرموں نے کہا۔ ''پر کبھی کبھی لینے والوں پر دینے کا وقت بھی آجاتا ہے۔ اقبال قائم۔ لے لیجیے نا! سرفراز مجھے اور بھیج دے گا۔''

''نہیں کرموں۔'' چودھری بولا۔ ''تم ہمارے میراثی ہو۔ تمہارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مانگو کیا مانگتے ہو اس کمبل کا؟ سرفے نے تمہیں بتایا تو ہوگا کہ اس نے کمبل کے کتنے روپے دیئے تھے۔''

''جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا۔'' کرموں کی آواز میں منصوبہ سازی کی گہرائی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر مسکرانے لگا اور بولا ''کمبل دوسرے ملک کا ہے نا جی۔ میں نے کہا بھی سرفراز سے کہ اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ بولا' کوئی بھی چیز ہمارے ابا کے آرام سے مہنگی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ تعلیم نے لڑکوں کے دماغ بگاڑ دیئے ہیں۔ اقبال قائم..... قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔''

''یعنی اتنی زیادہ ہے کہ سرفا میراثی یہ قیمت ادا کرسکتا ہے اور میں نہیں کرسکتا؟'' چودھری اپنے غصے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پوری طرح نہ چھپا سکا۔ ''بتاؤ کتنے میں آیا ہے۔ پچاس' سو' دوسو' تین سو..... کتنے میں؟''

''تین سو تو خیر نہیں جی۔'' کرموں نے چودھری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے جوتے لگانے سے پہلے منشی نے کرموں کو دیکھا تھا۔ ''کل دوسو باسٹھ میں آیا ہے۔'' اس نے حاضرین پر داد طلب نظریں ڈالیں۔

''اور اتنی رقم تمہارے بیٹے نے ادا کردی؟''

''کماتا کجاتا ہے نا اقبال قائم۔''

''تو تم مجھ سے دوسو باسٹھ روپے لوگے؟''

''آپ باسٹھ رہنے دیجیے۔ ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دوسرے دے دیجیے۔''

''دوسو باسٹھ میں باسٹھ اور ملا کر کیوں نہ دوں؟'' چودھری نے فاتحہ انداز سے کہا۔ ''آخر تم ہمارے میراثی ہو۔''

''چلیے زیادہ دے دیجیے اقبال قائم..... تین سو چوبیس دے دیجیے۔''

''تمہیں تو دکانداروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آ گیا!'' چودھری نے دل لگی کرنے کی کوشش کی۔

اور کرموں کمبل اتارتے ہوئے بولا ''میں تو اب بے حساب خرچ کرتا ہوں اقبال قائم۔ بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کا حساب آتا ہے۔''

چودھری نے کرموں کے چلائے ہوئے چابک سے بے نیاز ہوکر اپنے منشی سے کہا ''لو بھئی دے دو اسے تین سو چوبیس روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے!'' روپے کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کرموں نے منشی کو تاکید کی۔

''روپے نہیں تو پیسے؟''، منشی نے قمیص کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا نکالتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کے بجائے تین سو چوبیس جوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔''

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کی ایک چادر ہے جس پر کنکروں سے چاند ماری ہو رہی ہے۔

کرموں نے روپے لیے اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اسے خوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل کا میراثی پنا نکال رہا ہے۔ اسے تہہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔ ''کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔'' پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔ ''درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کمبل مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہیے۔''

''جوتا''......تجزیاتی نوٹ

احمد ندیم قاسمی برصغیر کے نمائندہ افسانہ نویس ہیں۔ ندیم قاسمی شاعر بھی تھے مگر ان کی وجہ شہرت افسانہ نگاری ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا تعلق گاؤں سے تھا اور ان کے زیادہ تر افسانے دیہاتی زندگی کے نشیب و فراز کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں زندگی کا بہت گہرہ مشاہدہ نظر آتا ہے اور وہ دیہات میں رہنے والوں کے معمولات، عادات و خصائل غرض اس پورے ماحول کو تمام جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ہمارے نصاب میں شامل ان کا افسانہ ''جوتا'' بھی گاؤں کی زندگی کا عکاس ہے۔ کہانی گاؤں کے چودھری اور کرموں میراثی کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ ذات پات، برادری، نسلی تفاخر، چودھری، سردار اور کمی کا تصور یہ سب ایسے معاملات ہیں جو ہمیں شہروں میں عمومی اور دیہات میں خصوصی طور پر نظر آتے ہیں۔ کرموں میراثی جب تک قوال پارٹی کے ساتھ تالیا بجاتا تھا تو لوگ اسے اس حالت میں تو منظور کر رہے تھے مگر اُس کے اندر زندگی کا شعور بیدار ہوا اور اُس نے اپنے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تو یہ سب کے لیے حیرت کا باعث بن جاتا ہے اور خاص کر کے گاؤں کا چودھری جو کسی اپنے سے کم درجے کے شخص کو ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتا اس پر برہمی کا اظہار کرتا ہے جیسے

> ''شرم کرو کرموں۔ میراثی ہو کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں ان سے لوگ ڈھول شہنائی کے بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں نام مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟''

یہ وہ ذہنیت اور سوچ ہے جس نے ہمارے معاشرے کے لیے ناسور بن گئی ہے اور اس سے ہم آزاد نہیں ہو سکتے۔ کرموں کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ میراثی کا بیٹا ہے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس سے وہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر چودھری کے برابر نظر آئے۔ مصنف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر انسان باشعور ہو جائے، اُسے آگہی نصیب ہو جائے تو یہ سوچ ہی نہیں بلکہ حالات بھی بدل جاتے ہیں اور ایسا صرف تعلیم سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کے وڈیرے عام آدمی کو تعلیم سے دور رکھتے ہیں۔ کرموں کے بیٹے میراثی ہونے سے نہیں شرماتے مگر یہ سوچ بھی ان میں بیدار ہو گئی ہے کہ ''چودھری کی طرح ہماری پیڑھی بھی تو حضرت آدمؑ سے ملتی ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ چودھری اور وڈیرے ان لوگوں کو تعلیم سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اگر یہ لوگ پڑھ لکھ جائیں گے تو ان وڈیروں کی جوتیاں کون سیدھی کرے گا۔

مصنف نے ان کرداروں کا ذکر بھی کیا ہے جو بات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں جن کا کام جلتی پر تیل ڈالنا ہوتا ہے۔ یہ کردار ازل سے موجود رہے ہیں اور شاید ابد تک رہیں گے۔ مصنف نے کرموں کی ترقی کی منازل اور چودھری کی پریشانیوں میں اضافے کو جس ترتیب سے پیش کیا ہے وہ نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ حقیقت کے قریب تر ہے۔ کرموں کا اپنی ذاتی بیٹھک بنوانا اور زکوٰۃ نکالنا چودھری کے دل پر نشتر کا کام کرتا ہے اور وہ کرموں کو گاہے بگاہے اپنے ڈیرے پر بلا کر جوتیاں لگواتا ہے۔ مگر کرموں کا جوتیاں گن کر یہ کہتا ہے کہ ''بس باسٹھ پورے ہوگئے میرا کوٹہ مجھے مل گیا زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہوگی۔'' یہ باتیں چودھری کی نام نہاد چودھراہٹ کا پول کھول دیتی ہیں۔

افسانے میں ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ جب ووٹ لکھنے والے کرموں میراثی کا پیشہ گداگری لکھنے لگتے ہیں تو کرموں بگڑ جاتا ہے ''نہیں صاحب میں گداگر نہیں ہوں'' یہاں مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ کرموں میراثی ہونے یا اپنا نام ''کرما'' اور اپنے باپ کا نام ''گاما'' ہونے پر شرمندہ نہیں ہے مگر وہ گداگری کو لعنت سمجھتا ہے اور یہ بات درست بھی ہے کیونکہ کرموں نے ساری زندگی اپنی محنت کی کمائی پر انحصار کیا ہے اور کرموں کا یہ کہنا کہ گداگر میں نہیں بلکہ چودھری ہے جو دوسروں کی کمائی پر انحصار کرتا ہے یہ بات شاید عملاً تو درست ہو مگر اخلاقیات کرموں کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں اس طرح کی رائے دے۔

جب کرموں کے بیٹے اپنے باپ کو ملائیشیا سے درآمد شدہ کمبل بھجواتے ہیں تو اس بات پر کرموں کا اترانا اور چودھری کی پریشانی بھی مخصوص سوچ کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ چودھری کسی بھی شکل میں کرموں میراثی کو اپنے برابر نہیں دیکھ سکتا۔ اس موقع پر کرموں اور چودھری کا مکالمہ بلاغت کا بہترین نمونہ ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ چودھری کرموں کو ڈیرے پر بلا کر بے عزت اور رسوا کرتا ہے مگر اصل حقائق ہر خاص و عام پر کھل چکے ہیں۔ چودھری کی شکست اُس کے لہجے اور حرکات و سکنات سے عیاں ہے۔ چودھری کا کرموں سے کمبل مہنگے داموں خریدنا چودھری کی بڑائی ثابت نہیں کرتا بلکہ اُس کے اندر کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

افسانے میں تشبیہات، طنزیہ، تیز اور چست جملوں کے استعمال سے کہانی کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے جیسے ''چودھری مسکرایا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سرا چھری سے چیر دیا ہو'' اور اسی طرح چودھری کا زمین سے تنکا اٹھا کر مسل دینا مشاہدے کی معراج ہے۔

افسانے کا آخری جملہ کہ ''جوتے کو پاؤں میں ہی رہنا چاہیے'' اُس مخصوص سوچ کی ترجمانی ہے جسے مصنف دکھانا چاہتا ہے۔ یہی افسانے کا مرکزی خیال ہے کہ ایک مخصوص سوچ کے لوگ اپنی نام نہاد عزت کو برقرار رکھنے کے لیے عام آدمی پر ترقی کے دروازے بند کر دیتے ہیں مگر وقت کے ساتھ شعور اور آگہی نے اس سوچ کو کافی حد تک بدل ڈالا ہے۔

فرہنگ.....جوتا

تال دینا: تالی سے ردھم بنانا، سر قائم رکھنا
تشویش: فکر، پریشانی
واجبی: معقول، درمیانہ، معمولی
گر: طریقہ، ہنر، وصف
ہارمونیم: سر نکالنے والا باجا، جو انگلیوں سے بجایا جاتا ہے
چپکا رہا: چپ رہا، خاموش رہا
جمگھٹا: بھیڑ، اکٹھ، ہجوم
نسلی پیشہ: خاندانی کام، جو نسل در نسل چلا آ رہا ہو
اقبال قائم: امیری یا بادشاہت قائم رہے (ایک تکیہ کلام)
اچھو ہو جانا: چھینک آنا، پانی خوراک کی نالی میں چلا جانا
دارہ: چوپال، بیٹھنے کی جگہ جہاں لوگ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں
مسٹنڈا: موٹا تازہ، منچلا، بدمعاش
رذیل: ذلیل، کمینہ، گھٹیا
زچ: تنگ، پریشان
دل جلے کے پھپھولے پھوڑنا: دل کا بغض نکالنا، غصہ نکالنا
نسلی کنگلا: خاندانی غریب (نفرت انگیز لہجہ ہے)
ٹھاٹھ: شان و شوکت، آن بان
اصطبل: گھوڑے باندھنے کی جگہ
افلاطون: یونانی فلسفی، ارسطو کا استاد

پدا: بہت چھوٹی سی چیز
رونگٹے کھڑے ہونا: خوف سے جسم کے بال کھڑے ہونا
تصحیح: درستی، اصلاح
آسودگی: خوش حالی، بےفکری
چاند ماری: نشانہ لگانے کی مشق
پوہ: ایک دیسی مہینے کا نام (سخت سردی)
پیڑھی: نسل، خاندان
اتھلا: کم ظرف، شوخا، فراز نہ رکھنے والا
آشیانہ: گھر
بگاڑ: بگڑ جانا، خراب ہونا
بے نیازی: لاپروائی
تجزیہ: کھنگالنا
تیور: انداز
چابک: کوڑا، ہنٹر، تازیانہ
سفوف: پاؤڈر، باریک پسا ہوا
سیانے: عقل مند
سِل: پتھر
گداگر: فقیر، مانگنے والا
لویں: کان کا نچلا حصہ

یونس جاوید

(پیدائش:1944ء)

یونس جاوید 23 اکتوبر 1944ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی) لاہور سے ایم-اے اردو کیا۔ بعدازاں مجلسِ ترقی ادب سے وابستہ رہے۔ یونس جاوید ایک اہم افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ڈراما نگار بھی ہیں اور ٹی وی ڈراما کے حوالے سے یونس جاوید ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ''اندھیرا اجالا'' ان کی مشہور ڈراما سیریل تھی۔ اس ڈرامے کے حوالے سے یونس جاوید نے خوب نام کمایا۔

یونس جاوید ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اور وہ معاشرتی ناہمواریوں پر براہِ راست بات کرتے ہیں اور اپنی بات کو علامت کے پردے میں چھپا کر بیان نہیں کرتے۔ یونس جاوید زیادہ تر ماڈرن طبقے کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

ہمارے نصاب میں شامل ان کا افسانہ ''دستک'' جدید دور میں معاشرتی بے حسی کی ایک زندہ مثال ہے جس میں انہوں نے واضح کرلیا ہے کہ ہم لوگ نہ تو اسلام کی اصل روح سے واقف ہیں اور نہ ہی ہم اخلاقیات کے معیار پر پورا اترتے ہیں۔ بلکہ ہم دکھاوے کے لیے سب کچھ کرگزرتے ہیں اور ہماری زندگیوں کا مقصد صرف نام نہاد شرافت اور نیکی کمانا ہے۔

یونس جاوید کو اپنی کہانی پر مکمل گرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ قاری سے اپنی مرضی کے مطابق نتائج اخذ کرواتے ہیں۔ وہ اپنے اندازِ بیان سے موضوع میں جان ڈال کر اسے زندہ بنانے کے گُر سے خوب واقف ہیں۔ دورِ جدید کے اہم افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

دستک

شاید پھر دستک ہوئی تھی۔

تین مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور میں جانتا تھا کہ دستک دینے والا کون ہے۔ میری بیوی تو اس دستک سے الرجک تھی۔ پتہ نہیں قصور میرا تھا یا نہیں مگر وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں قصوروار ہوں۔

پہلی مرتبہ..... ہاں پہلی مرتبہ..... مگر یہ تو کئی روز پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے گلی میں ایک تھڑے پر بیٹھا نظر آیا تھا۔ شاید پاگل تھا..... لیکن میں نے اس کے بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا..... میرے گزرنے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چلنے لگا' بالکل میرے پیچھے پیچھے مکان کے دروازے تک۔

''کیا ہے؟'' میں رک گیا۔ وہ خاموش رہا۔ میں اندر آ گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کے فوراً بعد میں نے دستک سنی..... یہ پہلی دستک تھی۔ میں نے بیوی کو آواز دی۔

''کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے میں نے کھڑکی کھولی' وہ سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تو پھر؟'' مجھے برا لگا۔ وہ اس وقت.....

''میں زخم زخم ہوں۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''کیا کہہ رہا ہے یہ؟'' بیوی پوچھ رہی تھی۔ پھر وہ خود ہی بولی۔ ''شہر جاؤ نا..... ڈسپنسری میں.....''

''سارا شہر نمک کا ہے۔'' اس کے لہجے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں تھی۔

''سارا شہر نمک کا ہے!'' بیوی نے دہرا دیا۔ ''تمہارے پلے کچھ پڑا؟..... مجھے تو پاگل لگتا ہے یہ۔''

''ہاں شاید۔'' رک کر میں نے اس سے پوچھا ''کیا چاہیے تمہیں؟''

''حرارت..... مجھے حرارت چاہیے۔'' اس کے لفظ یہی تھے..... ہاں یہی تھے۔

''حرارت چاہیے؟'' عجیب سا لگا مجھے۔

''جی ہاں۔'' وہ مُصر تھا۔

''تو میں کیا کروں۔'' میں چڑ گیا..... ''دھوپ میں بیٹھو جا کر۔''

''کوئی گرم کپڑا.....'' وہ رک گیا۔

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا..... ''مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا' کل آنا۔'' میں نے لمحہ بھر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ سچا ہے۔ اس نے صرف ایک قمیص پہن رکھی تھی۔ میلی..... پھٹی ہوئی..... آستینوں تک لیر لیر۔ کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں اور جلد کا رنگ پتہ نہیں کیا تھا..... میں نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔ واقعی سردی بہت تھی۔ کھڑے کھڑے گھٹنے تک سن ہو گئے تھے۔

بحال ہونے کے بعد میں نے بیوی سے کہا ''واقعی بہت سردی ہے۔ کوئی کپڑا اوپڑا تلاش کر دینا۔'' اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ اٹھ کر باہر نکل گئی۔

میں نے سوچا' یہ کام میں خود ہی کیوں نہ کرلوں۔ میں نے تلاش شروع کر دی مگر عجیب الجھن تھی۔ ہر کوٹ کے ساتھ کوئی نہ کوئی یادوابستہ تھی۔ ٹائی کی شکل میں..... اور ٹائیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ عیسیٰ کی صلیب کا نشان..... ہو سکتا ہے قبل از مسیح بھی ان کا رواج ہو..... مگر میری مشکل یہ تھی کہ ہر ٹائی میرے کسی نہ کسی دوست..... بے حد عزیز دوست کی طرف سے گفٹ تھی اور کسی نہ کسی کوٹ سے میچ تھی' لہٰذا کوئی بھی کوٹ نہ ملا۔

اصل میں کوئی پھٹا پرانا کوٹ تھا ہی نہیں۔

بس یہی میرا قصور تھا۔

بیوی کہتی تھی کہ اگر اس شخص سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو وہ اس طرح بار بار دستک دے کر تنگ تو نہ کرتا۔

مگر یہ کوئی دلیل تھی بھلا؟ ہم دن میں کتنے وعدے کرتے ہیں' توڑتے ہیں۔ ہر لمحے کے ساتھ ہماری حیثیت بدل جاتی ہے۔ ابھی باس تھے' ابھی ماتحت ہو گئے۔ کبھی شوہر' کبھی باپ ہر لمحے بات تو بدلنا ہی پڑتی ہے..... ایٹی کیٹس اور مینرز تو یہی ہیں۔

مگر وہ مجھے قصوروار ٹھہراتی تھی۔ بیویاں عموماً جھگڑالو ہوتی ہیں۔

''تم جھگڑالو ہو۔'' میں نے چلا کر کہا ''شادی کے بعد تم پر روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے اور تم ہو کہ.....''

اب کے چوتھی دستک تھی..... بیوی گھٹ کر رہ گئی۔

''کون ہے؟'' جانتے ہوئے بھی پوچھنا ضروری تھا۔

''میں ہوں۔'' آواز وہی تھی۔

''کہہ دیا نا پھر کسی وقت آنا.....'' میں نے پیچھا چھڑانا چاہا۔

''مجھے اندر آنے دیجیے..... باہر بہت ٹھنڈ ہے۔''

''اندر آنے دوں!'' میں نے کھڑکی کھول کر کہا ''کمال ہے..... جان نہ پہچان' اندر آنے دوں..... کون جانتا ہے تمہیں اس محلے میں؟''

''آپ جانتے ہیں مجھے۔'' وہ بولا۔

''میں؟'' مجھے حیرت ہوئی..... ''میں تو نہیں جانتا.....تم ہو کون؟''

''آدمی۔'' وہ بہت آہستہ بولا تھا۔

''آدمیوں والے کام بھی تو کرو.....'' میرا سارا غصہ کھڑکی بند کرنے میں نکل گیا تھا.....

''احمق۔'' بیوی بڑبڑائی۔

''کم بخت'' میں نے دانت پیسے۔

مگر اس نے پھر دستک دے دی۔

''کیا ہے؟'' میں جھلاّ گیا تھا.....وہ کچھ نہ بولا.....صرف تکے گیا۔ میری طرف.....گم سم۔ میں نے ماچس باہر پھینک دی۔ ''اٹھاؤ''.....میں نے کہا..... ''تنکے و تنکے جمع کر کے آگ جلا لو.....''

''تنکے؟'' وہ اس ایک لفظ پر رک گیا تھا.....وہ کھڑا رہا.....میں نے بھی کھڑکی بند نہیں کی۔ وہ بالکل پاگل لگ رہا تھا۔

''جاؤ نا اب.....مجھے سونے دو۔ دیکھو سنو.....'' میں نے کھڑی انگلی سے اسے دھمکایا۔ ''اب اگر دستک دی نا.....تو نمٹ لوں گا تم سے اچھی طرح۔''

وہ گیا تو نہیں مگر اس نے رخ پھیر لیا۔ بڑا ہی ڈھیٹ تھا۔ سکون غارت کر دیا تھا اس نے.....

''ہر ایرے غیرے کو منہ لگاتے ہو نا.....'' بیوی غرائی.....بخدا وہ غرائی تھی..... ''میں ہوتی تو.....''

''تم ہوتیں تو کیا کر لیتیں۔'' مجھے غصہ آ گیا تھا..... ''میں جانتا ہوں تمہیں.....کسی مسئلے میں شیئر کرنے کے بجائے تم سارا ملبہ مجھ پر لا دیتی ہو.....''

''کس نے کہا تھا کہ گدھوں والی حرکتیں کرو؟'' وہ اپنی عادت سے مجبور تھی۔

''دیکھو حد سے نہ بڑھو.....حد میں رہو.....'' میں چلاّیا..... ''چلو نکلو یہاں سے.....''

''ہاں.....ہاں'' اس نے لمبی ''ہاں'' میں سب کچھ کہہ دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں حد کے سرے پر آ گیا ہوں۔

''چائے پیو گے؟'' لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے میری کمزوری مجھے یاد دلا دی۔

''لے آؤ۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

وہ چائے لینے کے بہانے چلی گئی.....اپنی انا بچا لے گئی.....مگر چائے نہ لائی حتیٰ کہ میرے ہاتھ سردی سے سن ہو گئے.....انگلیاں برف تھیں۔ جھکتی نہ تھیں۔ میں نے جلدی سے ہیٹر آن کر دیا۔ چند لمحوں میں ہاتھ، پاؤں، انگلیاں، گھٹنے، ٹخنے پگھل سے گئے۔ مجھے گرمی لگنے لگی۔ اب کیا کیا جائے؟

میں نے روشندان کھولنے کی کوشش کی۔ ہیٹر گیس کا تھا اور روشندان کھول دینا ہی مناسب تھا بلکہ ضروری تھا.....مگر وہ کھل نہیں رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد بھی وہ نہ کھلا۔ شاید برسوں بند رہنے کی وجہ سے اس میں زنگ لگ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زوردار ٹھوکروں سے کھل جائے گا مگر مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ اترتی نیند کا نشہ سرور بن کر خون میں پھیل رہا تھا اور اس وقت ہر قسم کی

ٹھوکر لگانے کی سکت کو چاٹ رہا تھا۔

''نہ سہی۔'' میں نے سوچا۔ ''میں ہیٹر بند کر دیتا ہوں۔''

میں نے ہیٹر بند کر دیا..... ٹمپریچر نارمل ہونے لگا مگر کچی گیس سے کمرہ بھر گیا۔ یقیناً ہیٹر مین کچھ خرابی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا.....

میں نے دروازہ کھول دیا..... مگر گیس کے ساتھ حرارت بھی نکل گئی..... کمرہ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر بھی میں نے سونے کی کوشش کی اور سو گیا..... گہری نیند۔

پھر ایک زوردار دستک نے مجھے جگا دیا۔

سورج کی کرن بند روشندان سے اندر آ رہی تھی۔

دستک دوبارہ ہوئی مگر یہ اس طرح دستک نہ تھی دبی دبی سی..... کوئی زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا..... مجھے الجھن ہونے لگی۔

''کون ہے؟'' میں نے کھڑکی کھول کر پوچھا۔

''ہم ہیں جی۔'' آواز آئی..... میں نے باہر جھانکا۔ کچھ لوگ دروازے پر جمع تھے۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ وہ کون تھے! پتہ نہیں کون تھے۔ صبح ہی صبح کسی کے دروازے کو یوں پیٹتے ہیں بھلا۔ مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔

''حاجی افضل معلوم ہوتا ہے۔'' بیوی نے چائے بناتے ہوئے دور سے بتایا۔

''کون ہے وہ؟'' میں واقعی نہیں جانتا تھا۔

''محلے دار ہیں۔'' وہ بولی۔ ''دس بارہ سال سے پڑوسی ہیں اپنے۔''

''واقعی؟'' مجھے ندامت ہونے لگی۔

''ہاں ہاں۔'' اس نے یقینی انداز میں کہا۔

میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔

''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''دراصل مسئلہ ہی کچھ ایسا تھا۔''

''اندر تشریف لے آئیے.....'' مجھے ایٹی کیٹس بہت عزیز ہیں۔

''جی نہیں۔ بس کھڑے کھڑے.....'' رک کر اس نے بات بڑھائی۔ ''وہ درویش تھا نا اپنا.....''

''کون درویش؟''

''وہ جی، وہ پروفیسر تھا پہلے۔'' دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

''وہ پاگل؟ وہ پروفیسر تھا؟'' میں نے ہکلا کر پوچھا۔

''اوہ جی اب تو بس ایسے ہی تھا۔'' تیسرا بھی بول پڑا۔

''قصہ کیا ہے؟''میں بے صبرا ہو رہا تھا۔

''وہ رات مر گیا جی.....سردی سے.....''اس آدمی نے نجات بھرا سانس بھر کر کہا''کفن دفن کے لیے.....''

''جی ہاں.....تجہیز و تکفین.....''دوسرا اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں سمجھ گیا۔''میں نے کہا.....میں واقعی سمجھ گیا تھا۔''آپ کو پیسے چاہئیں نا؟ کتنے؟''

''جو توفیق ہو دے دیجیے۔''

''آپ کی ضرورت کیا ہے؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر لیڈر نما آدمی بولا۔''کچھ رقم جمع بھی ہو چکی ہے.....''

''کم کتنے ہیں؟''میں نے بات کاٹ دی۔ میں ابھی اور سونا چاہتا تھا..... ہاں کچھ دیر اور.....

''کم؟''وہ سوچنے لگا۔''کم.....لگ بھگ ڈیڑھ سو.....''

میں اندر لپکا.....

بیوی دروازے کے پیچھے سے سب کچھ سن چکی تھی.....بولی''کچھ زیادہ ہی دے دیجیے.....حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔''

میں نے اپنی جیب سے روپے نکالے تو اس نے اپنا پلو بھی کھول دیا۔''سو کا نوٹ ہے میری طرف سے۔''

میں نے دیکھا وہ بے حد سنجیدہ تھی اور دکھی بھی.....

''کوشش کیجیے.....''وہ بولی.....''کہ لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے.....''اور رک کر اس نے کہا.....

''یہ کمبل بھی.....سنا ہے میت کو بھی سردی لگتی ہے.....''

''ہاں.....''میں نے تائید کی.....''تم ٹھیک کہتی ہو۔''

محلے داروں سے.....میں نے کہا''کوشش کیجیے.....لاش زیادہ دیر تک سڑتی نہ رہے۔ ثواب کا کام ہے.....''میں نے روپے ان کی جھولی میں ڈال دیئے۔

واپس آ کر میں نے سونے کی کوشش کی مگر نیند اڑ چکی تھی۔ وہ آدمی ذہن سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔

''اچھا ہوا.....مر گیا.....بے چارہ.....''بیوی بولی.....''روز سردی میں ٹھٹھرتا تھا۔''

''ہاں.....''میں نے اطمینان کا سانس لے کر جواب دیا.....''کم از کم دستک تو نہ دے گا نا.....''

''اور کیا.....روز دروازہ پیٹتا تھا.....''یہ بڑبڑاہٹ میری بیوی کی تھی۔

''دستک''.....تجزیاتی نوٹ

یونس جاوید کا نام نمایاں افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہے۔ وہ افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ڈراما نگار بھی ہیں اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عوام میں ان کی مقبولیت ڈراما نگار کی حیثیت سے زیادہ ہوئی۔ انہیں ٹی وی سیریل ''اندھیرا اجالا'' سے کافی شہرت ملی۔ اس کے علاوہ بھی ان کے کئی ڈرامے خاص و عام میں مقبول ہوئے۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی عوام میں اور ادبی حلقوں میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے نصاب میں شامل ان کا افسانہ ''دستک'' معاشرتی بے حسی کی ایک زندہ مثال ہے۔ افسانہ تین کرداروں پر مشتمل ہے جن میں میاں، بیوی اور دستک دینے والا شخص شامل ہیں۔ کہانی کے آخر میں محلے داروں کا ذکر بھی آتا ہے مگر کہانی انہیں تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔

دروازے پر بار بار دستک ہوتی ہے اور میاں کھڑکی کھول کر دیکھتا ہے تو سامنے ایک شخص کھڑا ہے جو شکل سے نیم پاگل لگتا ہے جس نے صرف ایک پھٹی پرانی قمیص پہن رکھی ہے۔ یہ وہی شخص ہے جو میاں کو چند دن پہلے ایک تھڑے پر بیٹھا ہوا ملا تھا جو اُس کے پیچھے چلتا ہوا گھر کے دروازے تک آ گیا تھا..... بیوی اس کی دستک سے پریشان ہے اور اس کا قصوروار اپنے میاں کو سمجھتی ہے کہ اُس نے اس شخص کو کیوں منہ لگایا۔ نیم پاگل شخص سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور حرارت مانگتا ہے۔ وہی میاں جو بات بات کے ساتھ کہتا ہے کہ ''مجھے ایٹی کیٹس بہت عزیز ہیں'' چاہتے ہوئے بھی اُس شخص کی مدد نہیں کر پاتا اور بیوی سے اُلجھ پڑتا ہے۔

یونس جاوید نے افسانے میں یہ بتایا ہے کہ ہم کس قدر خودغرض اور لاپروا ہیں اور اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ بے حسی ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور ہم اپنی ضروریات سے آگے سوچ ہی نہیں سکتے۔ کہانی کا وہ حصہ بہت اہم ہے جب وہ شخص کہتا ہے کہ

''میں زخم زخم ہوں.....اور پورا شہر نمک کا ہے۔'' اس جملے سے مصنف نے ہماری پوری معاشرت کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے کہ ہم کسی غریب، محتاج کی مدد تو نہیں کر سکتے بلکہ ہم معاشی طور پر استحصال زدہ طبقے کی مشکلات میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ ہماری ذہنی سطح یہ ہے کہ بیوی میاں سے صرف اس لیے ناراض ہے کہ تم نے اس شخص کے لیے کھڑکی کیوں کھولی اور وہ اتنی بے دردی سے اُس شخص کو کہتی ہے ''شہر جاؤ نا...ڈسپنسری میں...'' میاں بھی کچھ پیچھے نہیں اور کہتا ہے کہ ''دھوپ میں بیٹھو جا کر'' جب کہ دوسری طرف وہ اصل حقیقت دیکھ بھی رہا ہے اور سمجھ بھی رہا ہے، سردی کی شدت بھی محسوس کر رہا ہے اور اُسے مانگنے والے کی

ضرورت کی اہمیت کا احساس بھی ہے۔ اُس کے اپنے الفاظ ہیں۔

''اُس نے صرف ایک قمیص پہن رکھی تھی میلی.... پھٹی ہوئی آستینوں تک لیر لیر' کلائیوں کی نیلی رگیں پھول رہی تھیں۔'' پھر اُس نے کھٹ سے کھڑکی بند کر دی کیونکہ '' کھڑے کھڑے گھٹنے تک سن ہو گئے تھے۔''

مگر یہ سب دیکھ کر بھی اُسے کوئی گرم کپڑا اس لیے نہیں دے پاتا کہ '' کوئی کپڑا اچھا پرانا ہے ہی نہیں'' اور سب کوٹوں سے یادیں وابستہ ہیں آخر میں ایک ماچس باہر پھینک دیتا ہے کہ گھاس پھونس کو آگ لگا کر حرارت حاصل کرو۔ یونس جاوید نے معاشرے کی دُہری شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے کہ ہم محفلوں اور تقریروں میں نعرہ بازی سے کام لیتے ہوئے اخلاقیات' ایمان' مذہب پر یوں زور دیتے ہیں کہ زمین آسمان کے کلابے ملا دیتے ہیں مگر ہماری اصلیت اُس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب ہمیں اپنے اقوال کا عملی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔

افسانے کا نقطۂ عروج وہ ہے جب محلے دار دروازے پر آ کر چندہ مانگتے ہیں کہ وہ نیم پاگل شخص جو ماضی میں ایک پروفیسر تھا رات سردی سے مر گیا اور اُس کے کفن دفن کے لیے کچھ پیسے درکار ہیں۔ نہ صرف میاں بڑھ چڑھ کر امداد کرتا ہے بلکہ بیوی بھی اپنے پلے سے سو کا نوٹ نکال کر دیتی ہے اور کہتی ہے '' کچھ زیادہ ہی دے دیجئے... حیثیت کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔''

مصنف یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ ہم ظاہری نمود و نمائش اور معاشرتی حیثیت کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے مگر جہاں کرنے کی ضرورت ہے وہاں ہم نہ صرف بخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ہمارا رویہ غیر انسانی ہوتا ہے۔ بیوی لاش پر ڈالنے کے لیے گرم کمبل دے دیتی ہے کہ '' سنا ہے میت کو سردی لگتی ہے'' مگر جب وہ زندہ تھا تو کمبل دینا تو درکنار اُس کی شکل دیکھنے سے بھی گریزاں تھی۔ یہ سب وہ سوال ہیں جو یونس جاوید نے افسانے میں اٹھائے ہیں اور بطور قوم مجموعی طور پر اور بطور فرد انفرادی طور پر ہمیں اپنے آپ سے کرنے چاہیے۔ پھر ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ہم اخلاق' محبت اور مذہب کی اصل روح سے بے بہرہ اور غافل ہیں ہم ان کا پرچار تو کرتے ہیں مگر عمل سے کوسوں دور ہیں۔

افسانے میں چست جملوں سے مصنف نے کہانی کی خوبصورتی اور دلچسپی میں اضافہ کیا ہے جیسے '' شادی کے بعد تم پر روپ اور مجھ پر قرض چڑھا ہے'' اس کے علاوہ آپس کی بحث میں بیوی کا میاں کو '' گدھا'' کہہ دینا بیوی کے کردار کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ نو دولتیے طبقے کی ایک مثال ہے۔ گیس کے ہٹر کی گھٹن اصل میں '' میاں'' کے اندر کی گھٹن ہے اور اپنے عمل پر شرمندگی کا احساس ہے مگر اس کا عملی مظاہرہ نہیں ملتا۔

’’دستک‘‘.....فرہنگ

الرجک: نفرت کرنا‘ پرہیز کرنا
مُصر: ضدی‘ اصرار کرنے والا
لیرلیر: پھٹا ہوا‘ ٹکڑوں میں
بحال کرنا: اصلی حالت میں لانا‘ واپس لانا
صلیب: (حضرت عیسیٰ کی سولی کا نشان) عیسائیوں کی مذہبی علامت
میچ: برابر‘ ایک جیسا‘ موازنہ
ایٹی کیٹس: محفل کے آداب‘ اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ
جھلا کر: تنگ آ کر‘ غصے میں آ کر
ڈھیٹ: بات نہ ماننے والا‘ اڑیل‘ ضدی
غارت: تباہ و برباد
زحمت: تکلیف‘ مشکل
ہکلا کر: بات کرتے ہوئے اٹکنا‘ لکنت
تجہیز و تکفین: کفن دفن کا اہتمام
بڑبڑانا: آہستہ سے بولنا
پلے پڑنا: بات سمجھ جانا
دستک: دروازہ کھٹکھٹانا
ایرے غیرے: اجنبی‘ انجام‘ عام آدمی

تائید: حمایت
حرارت: گرمی
ٹھٹھرنا: سردی سے کانپنا
دلیل: ثبوت
سرور: لطف
سکت: ہمت‘ طاقت
سن ہونا: سردی سے خون جم جانا
قبل از مسیح: حضرت عیسیٰ سے بھی پہلے زمانے کا
ماتحت: زیرنگیں‘ نائب
ندامت: شرمندی
لگ بھگ: تقریباً‘ قریب قریب
دروازہ پیٹنا: دروازہ کھٹکھٹانا
پلّو: دوپٹے کا ایک کونا‘ سرا

غلام عباس

(1909ء.....1982ء)

غلام عباس 1909ء میں امرتسر بھارت میں پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز کر دیا۔ شروع میں غلام عباس غیر ملکی افسانوں کے ترجمے کرتے رہے۔ 1928ء سے 1937ء تک بچوں کے رسالوں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' کے ایڈیٹر رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور آل انڈیا ریڈیو کے رسالوں ''آواز'' اور ''سارنگ'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ کر ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور ریڈیو کے رسالے ''آہنگ'' کے مدیر بھی رہے۔ کچھ عرصہ بی بی سی (لندن) میں کام کیا اور 1982ء میں کراچی میں وفات پا گئے۔

غلام عباس ایک بلند پایہ افسانہ نگار کے طور پر مانے اور جانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خصوصیات میں موضوع کی جدت اور ان کا اندازِ تحریر شامل ہے اور ان کا یہی انداز ان کو دوسرے افسانہ نگاروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ ان کے انداز میں ایک ٹھہراؤ ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے اور وہ اپنے اندر کوئی نفسیاتی خلا محسوس نہیں کرتا۔ غلام عباس زندگی کی ناہمواریوں پر ایک ماہر افسانہ نگار کی طرح نظر رکھتے ہیں اور ان کے موضوعات اور کردار نہ صرف ہمارے معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں بلکہ وہ ہمیں عام زندگی میں اپنے اردگرد نظر آتے ہیں۔

غلام عباس زندگی کے رنگوں سے موضوعات حاصل کرتے ہیں اور پھر ان موضوعات کو اپنے انداز میں رنگ کر اور بھی اہم بنا دیتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار کٹھ پتلی نہیں ہوتے بلکہ زندہ ہوتے ہیں اور زندگی کے تمام رویے ان کرداروں میں نظر آتے ہیں اور یہ کردار یکسانیت کا شکار نہیں ہیں بلکہ حرکت و عمل کا پیکر ہیں۔

غلام عباس تصویر کاری اور جزئیات نگاری میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں اور یہی جزئیات نگاری اور منظر کشی ان کے افسانوں کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے اور اس کی بنا پر غلام عباس قاری کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتے۔ غلام عباس زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں، زندگی کا قریب سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ زندگی کا کوئی پہلو ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ غلام عباس انسانی رویوں کو تمام تر تلخیوں کے ساتھ منظور کرتے ہیں۔ جس کی زندہ مثال ان کا افسانہ ''آنندی'' ہے۔ بقول راشد ''غلام عباس زندگی سے سرگوشیاں کرتا ہے اور اس سے سرگوشیاں سنتا ہے۔''

غلام عباس حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں وہ جذبے اور تخیل کو عقل کے تابع رکھتے ہیں۔ غلام عباس زندگی کی منافقت اور اندرونی و بیرونی تضاد کو بڑی مہارت سے بیان کرتا ہے اور وہ قاری کے سامنے زندگی کے رویوں کو یوں عریاں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور افسانے کے انجام سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

''اوورکوٹ'' غلام عباس کا نمائندہ افسانہ ہے اس میں متوسط بلکہ زیریں متوسط طبقے کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو پیش کیا گیا ہے جو غلام عباس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ہ ادبی زندگی کا آغاز کر دیا۔ شروع میں
سالوں ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں''
انڈیا ریڈیو کے رسالوں ''آواز'' اور
اور ریڈیو کے رسالے ''آہنگ'' کے
ے۔

افسانوں کی خصوصیات میں موضوع
ر دمقام عطا کرتا ہے۔ ان کے انداز
م عباس زندگی کی ناہمواریوں پر ایک
ے کا حصہ ہوتے ہیں بلکہ وہ ہمیں عام

ت کو اپنے انداز میں رنگ کر اور بھی
م رویے ان کرداروں میں نظر آتے

اری اور منظر کشی ان کے افسانوں کی
یتے۔ غلام عباس زندگی کی آنکھوں
و غلط نہ ہوگا کہ زندگی کا کوئی پہلو ان
تے ہیں۔ جس کی زندہ مثال ان کا
ہاں سنتا ہے۔''

اوورکوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیئرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹڑی پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سُرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوورکوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا۔ سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ، سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ آ کے لگتی تھی مگر اُس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا اور لوگ تو خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اُسے اِس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزا آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے ''نو تھینک یو'' کہہ کر اُسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا، اُس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کر رقص کی ایک انگریزی دھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے، ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا اُس کو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی، گویا کرکٹ کا کھیل ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی مگر اس وقت شام کے دھندلے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے اُدھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیئرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اُس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اُس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اُڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرتا کہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اُتر

جائے، بت کے آس پاس لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی گیند سے کھیل رہے تھے، وہ رک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تو اُس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے مگر جب وہ تکے ہی چلا گیا تو رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وہ گھاس کے اُس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی، اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے۔ تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے ورغلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصولِ لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسبِ توفیق ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی، پٹڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دو رویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریحِ طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی، وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگا رنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ اُن کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبا اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو، زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے، ہر قسم کے اوورکوٹ، قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا، پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اُس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اِس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ بانہوں کی کریز بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اُس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا۔ نوجوان نے آواز دی۔

''پان والا!''

''جناب!''

''دس کا چینج ہے؟''

''ہے تو نہیں، لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟''

''نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟''

''اجی واہ، کوئی چور اُچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟''

''نہیں نہیں۔ ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔''

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں نے اُس پر سُرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اُس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بنچ پر آ چڑھی۔ اُس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''پور لٹل سول!'' (Poor Little Soul)

اس کے بعد وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اُس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ برآمدے میں بھیڑ نہ تھی، صرف چند لوگ تھے جو آنے والی فلموں کا جائزہ لے رہے تھے۔ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں اِن تصویروں کو ذوق شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک خاص شانِ استغنا کے ساتھ مگر صنف نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی اُن کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے اُن تصویروں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی، اتنے میں ایک لڑکی نے، جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی، دوسری لڑکی کے کان میں کچھ کہا، جسے سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹری پر پھر پہلے کی طرح مٹرگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوان میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے، جو مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے۔ کچھ راہگیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر، یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے کیونکہ وہ غل غپاڑہ نہیں مچا رہے تھے بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے حالانکہ دھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ چلنتر گانے تھے۔ سرورق خوب صورت، رنگ دار مگر دھنیں گھٹیا۔ ایک پھسلتی ہوئی نظر ان پر ڈالی، پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی، ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کے ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا، اس کا کور اٹھا کر انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور کو بند کر دیا۔

پیانو کی آواز سن کر دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر، کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ ہاں گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دو اس مہینے کی۔"

فہرست لے کر اوورکوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا اور پھر چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال آیا۔ نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا اور آگے بڑھتا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک نے جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں، یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو بتیس روپے۔"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا "او ہو اتنی!"

دکاندار نے کہا "آپ پسند کر لیجیے، ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔"

"شکریہ! لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھیے، آپ ہی کی دکان ہے۔"

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا، وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پُراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائیکورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی فطری چونچالی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹری پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فاصلہ رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی "او سوری" کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔

اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیردار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھرکم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چُٹلا گندھا ہوا تھا جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چُٹلے کا پھندنا اچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔ نوجوان کے لیے جو ان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا یہ نظارہ خاصا جاذبِ نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

''ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!! ہرگز نہیں!!!''

''سنو میرا کہنا مانو۔'' لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا'' ڈاکٹر میرا دوست ہے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔''

''نہیں، نہیں، نہیں!''

''میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہوگی۔''

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

''تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہوگا۔ ذرا اُن کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔''

''چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا، فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اُسے سروکار ہی نہ تھا مگر اُس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کردار کی سی ادا تھی، جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لڑکا اور لڑکی پل بھر کو رکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان مال روڈ پر ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفور ان کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے، اس لیے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہیے۔

جب وہ لوگ کئی گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے کچلتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا ہے اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے کر بھاگا۔ دو تین راہگیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے، شور مچانے لگے کہ ''نمبر دیکھو! نمبر دیکھو!!'' مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا، رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچلی گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اُسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اُسے اسٹریچر پر ڈال کر آپریشن روم میں لے جایا جا رہا تھا تو اِن نرسوں کی نظر اُس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوورکوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے

ازراہِ دردمندی اس کی سبز فیلٹ ہیٹ اٹھا کے اُس کے سینہ پر رکھ دی تا کہ کوئی اُڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا:

''کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بیچارہ!''

گل دبی آواز میں بولی

''خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ ہفتے کی شام منانے!''

''ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟''

''نہیں، بھاگ گیا۔''

''کتنے افسوس کی بات ہے!''

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے اُن کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگِ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا، اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی، پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں، حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اُس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اُتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں، چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر سرے سے قمیص ہی نہیں تھی...... اوورکوٹ اُتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اُونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے سے لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا۔ البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا، سویٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جو شاید کبھی نکٹائی رہی ہوگی، خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے۔ دونوں ٹانگوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگِ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا، کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اُس کی روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چُرا رہا ہے۔

اس کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، وہ یہ تھیں۔

ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹرگشت کے دوران اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے اور اس نے انہیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اُس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی، اِس فہرست میں شامل نہ تھی۔

''اوورکوٹ''.....تجزیاتی نوٹ

غلام عباس افسانوی ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ وہ جدید افسانہ نگاروں میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ اگر چند اہم افسانہ نگاروں کی فہرست بنائی جائے تو غلام عباس کا نام بھی اُس میں شامل ہوگا۔ ان کے افسانوں کی خصوصیت، ان کا انداز اور موضوع کی جدت ہے۔ وہ سیدھے سادے طریقے سے بات کرتے ہیں مگر پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ اُن کے انداز میں ایک ٹھہراؤ ہے اور وہ اپنے اندازِ تحریر کی بنا پر ہی قاری کو اپنے دام سے باہر نہیں جانے دیتے۔

ہمارے نصاب میں شامل افسانہ ''اوورکوٹ'' ان کے شاہکار افسانوں میں شامل ہے۔ اس افسانے میں زیریں متوسط طبقے (Lower Middle Class) کے مسائل کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس طبقے کے لوگ ظاہری رکھ رکھاؤ اور بناوٹ پر زور دیتے ہیں۔ اصل میں زیریں متوسط طبقے کے لوگ امرا کا لبادہ اوڑھ کر غربا میں ممتاز ہونے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کا تعلق غریب طبقے سے ہی ہوتا ہے اور یہی کشمکش اس طبقے کے لوگوں کے لیے تباہی کا باعث بنتی ہے اور یہی ان کی زندگی کا المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔

''اوورکوٹ'' ایک مختصر مگر شاہکار افسانہ ہے جس میں ایک ایسے نوجوان کو دکھایا گیا ہے جو اپنی اصل زندگی سے ہٹ کر بناوٹ اور ظاہرداری کا شکار ہے۔ جو معاشرے سے اپنا اصل مقام چھپا رہا ہے جسے امرا کی صف میں آنے کا شوق ہے، جو تصوراتی زندگی کو حقیقت پر ترجیح دیتا ہے۔ جو اپنے عیوب کے ساتھ ساتھ اپنی معاشی اور مالی حالت کو بھی چھپانا چاہتا ہے۔ جو بظاہر کاغذی پیرہن پہن کر مسرت کے داغوں کو ڈھانپنا چاہتا ہے مگر اس بہروپ کا انجام ایک المیے کی شکل میں سامنے آتا ہے جس میں اُس کی موت کی شکل میں اس کے بہروپ کا پول بھی کھل جاتا ہے۔

افسانہ ڈیوس روڈ کے چوک (موجودہ کلب چوک) سے شروع ہوتا ہے جہاں سے افسانے کا مرکزی کردار مال روڈ پر چلنا شروع کرتا ہے اور جنرل پوسٹ آفس والے چوک پر ایک ناگہانی حادثے کی شکل میں اختتام پذیر ہوجاتا ہے۔ اس دوران غلام عباس نے افسانے کے مرکزی کردار (جو کہ انتہائی خوش لباس ہے) کو جس طرح پیش کیا ہے یہ انداز صرف غلام عباس ہی کا خاصا ہے۔ نوجوان کی شکل وصورت، لباس، انداز، بول چال اور حرکات وسکنات سے غلام عباس نے جدید (Modern) طبقے کے نوجوان کو پیش کیا ہے جو غلام عباس کے مشاہدے کی دلیل ہے۔ میوزک کے آلات سے لے کر قالین کی دکان تک نوجوان کے

رویے سے غلام عباس نے جدید طبقے کے اوصاف اور اطوار کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی ہے۔

افسانے کا انجام ایک ایسے المیے کی صورت میں ہوتا ہے جو قاری کی توقع کے بالکل برعکس ہے۔ مرنے والے نوجوان کی اصل حالت کا پتہ چلنے کے بعد قاری کے جذبات ہمدردی اور دکھ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جو کہ کسی بھی المیے کا منطقی انجام ہے۔

غلام عباس اپنے افسانوں کے کردار، اپنے اردگرد کے ماحول سے منتخب کرتے ہیں اور یہ کردار زندہ ہوتے ہیں۔ ان میں جمود نہیں ہوتا بلکہ مسلسل حرکت ہوتی ہے۔ غلام عباس کو جزئیات نگاری اور منظر نگاری پر عبور حاصل ہے اور وہ اپنے فن کے باوصف قاری کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں اور پڑھنے والے سے اپنی مرضی کا نتیجہ اخذ کرواتے ہیں۔

(''اوورکوٹ'' غلام عباس کا ہی نہیں اردو ادب کا ایک نمائندہ افسانہ ہے)

"اوورکوٹ"......فرہنگ

آؤ بھگت: مہمان داری، خاطر تواضع
بانکپن: شوخی، نخرہ، جوانی
ازراہِ دردمندی: ہمدردی سے، دردمندی سے
جراحی: آپریشن
بیش قیمت: مہنگا، قیمتی
خجل: شرمندہ
خراماں خراماں: مزے سے چلنا، آہستہ چلنا
خوش پوش: خوش لباس، اچھے کپڑے پہننے والا
تندہوا: تیز ہوا
دھجی: کپڑے کی کترن
رمق: آخری ہچکی، آخری دم
کڑکڑاتے جانا: غرور سے چلنا
فلیٹ: گول جھالروالی انگریزی ٹوپی، ہیٹ کی طرح
چھڑی: باریک سوٹی
گلوبند: گلے میں باندھنے والا رومال (ریشمی)
قراقلی ٹوپی: ٹوپی کی ایک قسم
متانت: حلیمی

رفتہ رفتہ: آہستہ آہستہ
مٹر گشت: چہل قدمی
یکبارگی: اچانک، ایک دم
بوسیدہ: پرانہ
کہرا: سخت سردی، برف کی تہہ
استطاعت: گنجائش، ہمت
زن ومرد: مرد اور عورتیں
سلوٹ: بل
چیدہ چیدہ: کچھ کچھ
غل غپاڑہ: شور، ہنگامہ
ہسپانوی گٹار: سپین کا بنا ہوا گٹار
جرمن پیانو: جرمنی کا بنا ہوا باجا
سنگِ مرمر: ملائم پتھر
تھمادیا: پکڑادیا
پتلون: پنٹ

انتظار حسین

(پیدائش 1925ء.....)

انتظار حسین عصرِ حاضر کے مانے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ وہ صرف افسانہ نویس ہی نہیں بلکہ ناول نگار، کالم نگار، صحافی اور نقاد ہیں مگر اُن کا اصل میدان افسانہ ہی ہے۔ انتظار حسین 12 دسمبر 1925ء کو ڈبائی ضلع بلند یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ 1946ء میں میرٹھ کالج سے ایم۔اے اردو کیا۔ بعد میں پاکستان آ کر لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

انتظار حسین ماشاءاللہ ابھی حیات ہیں اور زندگی کی نوے کے قریب بہاریں دیکھ چکے ہیں اور ابھی بھی اُن کا قلم رواں دواں ہے۔ انتظار حسین نے زیادہ تر افسانے پاکستان بننے کے بعد لکھے اور ان کے افسانوں کے کئی مجموعے سامنے آچکے ہیں۔ جن میں ''گلی کوچے''، ''کنکری''، ''آخری آدمی''، ''شہرِ افسوس''، ''کچھوے''، ''خیمے سے دور'' اور ''پنجرہ'' شامل ہیں۔ ''چاند گرہن''، ''دن اور داستان''، ''آگے سمندر ہے''، ''تذکرہ'' جیسے ناول/ ناولٹ بھی شامل ہیں۔

انتظار حسین نے تقسیم کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر پاکستان بننے کے بعد کے مسائل سے بھی آگاہی ہوتی رہی۔ سیاسی اور سماجی منظرنامے بھی ان کے سامنے بدلتے رہے۔ یہ تماشا انتظار حسین نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ تمام مارشل لاء کا تجربہ بھی انہیں ہوا جہاں ادیبوں اور شاعروں پر اظہار رائے کی پابندی ہوتی ہے جس کی وجہ سے انتظار حسین نے اظہار کے لیے علامت کا راستہ اختیار کیا۔ بات کو پردے میں چھپا کر کرنے کے فن سے انتظار حسین بخوبی آگاہ ہیں۔ اس حوالے سے ان کے افسانے جن میں ''کشتی''، ''بادل'' اور ''آخری آدمی'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ ہمارے نصاب میں شامل ان کا افسانہ ''آخری آدمی'' اور ''بادل'' بھی علامتی افسانے ہیں۔

انتظار حسین کے افسانوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ انتظار حسین نے جو بھی دیکھا اُسے اپنے قلم کے سپرد کردیا۔ وہ ایک بلند پایہ اور متوازن شخصیت والے غیر متنازعہ ادیب ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔

آخری آدمی

الیاسف اس قریے کا آخری آدمی تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جُون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جُون میں مروں گا اور اس نے آدمی کی جُون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے، پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغوں کو خراب کرتے تھے، نابود ہو گئے۔ اس پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا، یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا ہے کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجردم الیعذر کی خوابگاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو کی خوابگاہ تک گئی اور حیران و ہراساں واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور تک لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خوابگاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خوابگاہ میں الیعذر کے بجائے ایک بندر آرام کرتا تھا اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز! الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر وہ زور سے ہنسا "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا۔" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اس کا منہ سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا شخص حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب، ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا "اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا ہے۔" ابن زبلون نے اس کا برا مانا اور غصہ سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا "اے زبلون کے بیٹے تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔" اس پر زبلون کا منہ غصہ سے لال ہو گیا اور وہ دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہو گیا اور ابن زبلون کا چہرہ غصہ سے الیاب کا چہرہ خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا چلا گیا اور وہ دونوں کہ ایک مجسم غصہ اور خوف کی پوٹ تھا، آپس میں گتھ گئے۔ ان کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھر ان کے اعضا بگڑے۔ پھر ان کی آوازیں

ہی نہیں بلکہ ناول نگار، کالم نگار، صحافی اور
ع بلند یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔
ونت اختیار کر لی۔
دیکھ چکے ہیں اور ابھی بھی اُن کا قلم رواں
انوں کے کئی مجموعے سامنے آ چکے ہیں۔
سے دور" اور "پنجرہ" شامل ہیں۔ "چاند
ہیں۔
بعد کے مسائل سے بھی آگاہی ہوتی رہی۔
گتی آنکھوں سے دیکھا۔ تمام مارشل لاء کا
ی وجہ سے انتظار حسین نے اظہار کے لیے
بخوبی آگاہ ہیں۔ اس حوالے سے ان کے
ے نصاب میں شامل ان کا افسانہ "آخری
جا سکتا ہے۔ انتظار حسین نے جو بھی دیکھا
دیب ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے لیے دعا گو

بگڑیں کہ الفاظ آپس میں خلط ملط ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقلمند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا، تشویش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہوگیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہو کے دیر تک پکارا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا ''اے لوگو! وہ شخص ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا۔ آج وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔'' لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انہیں آلیا۔ وحشت سے صورتیں ان کی چپٹی ہونے لگیں اور خدوخال مسخ ہوتے چلے گئے اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتہ میں آ گیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب وہ ڈرا اور ان سے کترا کر چلا اور بستی کے آخری کنارے تک گیا اور کسی آدمی کو نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی سمندر کے کنارے، اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کٹورا بجتا تھا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہوگئیں اور اونچے برجوں میں عالیشان چھتوں پر بندر نظر آنے لگے اور الیاسف نے ہراس سے چہار سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ کیا میں اکیلا آدمی ہوں اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جُون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جُون میں مروں گا اور اس نے ایک احساسِ برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا، تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جُون میں ہوں اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی اور نفرت سے اس کا چہرہ بگڑنے لگا مگر اسے اچانک ابن زبلون کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہوگئی تھی۔ اس نے کہا کہ اے الیاسف نفرت مت کر کہ آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انہیں میں سے تھا اور اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا اور اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہیں۔ چھاتیاں ہرن کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں۔ پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے اور الیاف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صنوبر کے گول پیالے کی تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے؟ وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے، دیکھ موسم کہ بہار کا مہینہ گزر گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہوگئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں

ہے اے خضر کی بیٹی! اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا کہ اس کا جی بھر آیا اور وہ بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا مگر اچانک اسے الیعذ رکی جورو یاد آئی جو الیعذ رکو بندر کی جُون میں دیکھ کر روتی چلی گئی کہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے اور ہڑکی کی آواز وحشی ہوتی چلی گئی...... یہاں تک کہ اس کی جُون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا کہ بنت الاخضر جن میں سے تھی، ان میں جا ملی اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر مبادا تو ان میں سے ہو جائے اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کی لال بھبھوکا صورتوں اور کھڑی دُموں کو دیکھ کر ہنسا اور الیاسف کو الیعذ رکی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں اور الیعذ ر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ الیعذ راس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذ رکی جوئیں بین بین کر کھاتی تھی۔ الیعذ ر جھر جھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دُم کھڑی کر کے اپنے میلے کچیلے پنجوں پر اٹھ بیٹھتی اور الیعذ ر کے اگلے پیر اس کے بدرنگ بالوں والی پشت پر ٹک جاتے۔ الیاسف یہ دیکھ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا اور اس کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوئی کہ اس سے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی اور وہ اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا ''اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی جنس بن جائے۔'' اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، رونے اور ہنسنے سے، ہر کیفیت سے گزر گیا اور ہم جنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اُچکنا، دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا، کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا یہ سب کچھ اسے کبھی ہم جنسوں پر رُلاتا تھا، کبھی ہنساتا تھا، کبھی غصہ دلاتا تھا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا اور انہیں حقارت سے دیکھتا۔ پھر یوں ہوا کہ انہیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ اور بڑی آواز دے کر جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہو۔ کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جُٹ گئے اور الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ دار نہیں رہے تھے اور اس نے اس کا افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ آج لفظ مر گیا اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا

وہ غیر ملفوظ آوازیں وحشیانہ چیخیں بن گئیں

ش سے کہا کہ اے لوگو! مقرر ہمیں کچھ ہو گیا
ا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس
آواز سے بولا ''اے لوگو! وہ شخص ہمیں سبت
میں ہمارے لیے خرابی ہے۔'' لوگوں نے یہ
نے لگیں اور خدوخال مسخ ہوتے چلے گئے اور
ے۔ تب وہ ڈرا اور ان سے کترا کر چلا اور بستی
سندر کے کنارے، اونچے برجوں اور بڑے
ا۔ پر دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی
اور الیاسف نے ہراس سے چہار سمت نظر
منے لگا مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس
غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں
حساسِ برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم
ی جُون میں ہوں اور الیاسف نے اپنے ہم
خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس
ے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔
ھا اور اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں
ہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے
اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے
را سے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا اور
کے بچوں کے موافق تڑپتی ہیں۔ پیٹ اس کا
نت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم
الے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا
ر تو کہاں ہے؟ وہ کہ جس کے لیے میرا جی چاہتا
یاں اونچی شاخوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں۔ تو کہاں

اور خاموش ہو گیا۔

الیاسف خاموش ہو گیا اور محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے ہنسنے اور رونے سے درگزرا اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کران سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لے لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان اور جزیرے نے کہا کہ گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا، گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں کہ جذبہ کی کوئی رو اسے بہا کر نہ لے جائے اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کرنے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑ گئی ہے۔ اس نے فکر مند ہو کر کہا ''اے معبود! کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔'' تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی اور اسے گمان ہونے لگا کہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے کہ اس کے اعضا خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے اور وہ ڈرا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا، میں اندر کے خوف پر اسی طور پر غلبہ پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف سے غلبہ پایا تھا اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پایا اور اس کے سمٹے ہوئے اعضا کھلنے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑتے گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے۔ تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بدہیئت اعضا کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا میں، میں نہیں رہا۔ اس خیال سے دل اس کا ڈھینے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضا پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی کہ اس کے اعضاء تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بے شک میں اپنی جون میں ہوں مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضا بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنویں میں دھنسا جا رہا ہے اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے میرے معبود! میرے باہر بھی دوزخ

ہے، میرے اندر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنویں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گزری ہوئی یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کو مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا اور ان کی ہوس بڑھتی گئی اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کو مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا، سمندر تمہارے دستِ ہوس سے پناہ مانگتا ہے۔ سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا اور الیاسف نے کہ عقل کا پُتلا تھا، سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا، یہ کہہ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا کہ اللہ اس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ وہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے پیدا کیا جیسا کہ پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندروں کے اسلوب پر ڈھالے گا اور الیاسف اپنے حال پر رویا۔ اس کے بنائے ہوئے پشتے میں دراڑ پڑ گئی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پر رو دیا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آئی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں میں بیٹھ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دُکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضا پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کہ کیا میں، میں ہی ہوں اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش یہاں پر کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جُون میں ہے۔ یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے کہ آدمی، آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندر سے بھر گئی اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر، اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے، تجھے میں اُونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم۔ قسم ہے تجھے کبوتریوں کی

جب وہ بلندیوں میں پرواز کریں۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی جب وہ بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے تجھے اندھیرے کی اور نیند کی اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں، تو مجھ سے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ گڈمڈ ہو گئے جیسے زنجیر الجھ گئی ہو۔ جیسے لفظ مٹ رہے ہوں جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پر غور کیا اور ابن زبلون اور الیاب کو یاد کیا کیونکہ ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور اس نے سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعے وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں بدلا نہیں ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کی طرف جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثناء میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آلیا اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا تھا اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا چلا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دُکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھوں پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔

''آخری آدمی''.....تجزیاتی نوٹ

سورۃ آلِ عمران میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:''اے اولادِ آدم کیا ہمارا تمہارا یہ عہد نہیں کہ خواہ تم پر کچھ بھی گزر جائے تم بدی کے سامنے سر نہیں جھکاؤ گے۔''

انتظار حسین کے افسانے''آخری آدمی'' کا موضوع بھی انسان کے خدا سے کیے گئے وعدے کی خلاف ورزی پر مبنی ہے۔کہانی کا تانا بانا بنی اسرائیل کے یومِ سبت کو مچھلیاں پکڑنے اور کھانے کی ممانعت کے واقعے سے لیا گیا ہے۔بنی اسرائیل کو کہا گیا تھا کہ وہ ہفتے کے دن دریائے نیل سے مچھلیاں پکڑ کر نہ کھائیں۔انہوں نے دریائے نیل سے کچھ دور ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اُسے دریا سے ملا دیا......

> ''الیاسف نے کہ عقل کا پُتلا تھا سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملا دیا۔سبت کے دن جب مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا، یہ دیکھ کر بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اُس سے مکر کرے گا اور بے شک اللہ زیادہ مکر کرنے والا ہے۔''

انسانی زندگی میں عہد مندی (Cometment) بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔انسان کا اپنی ذات سے، دوسروں سے، اپنی قوم سے، ملک سے اور خدا کی ذات سے ایفائے عہد ہوتا ہے اور اسی عہد مندی سے اُس شے، ہستی یا جذبے کی اہمیت کا تعین ہوتا ہے۔

انتظار حسین ایک قرآنی واقعے کو بنیاد بنا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب انسان اپنا عہد توڑتا ہے تو انسانیت سے ہی نہیں بلکہ آدمیت کے مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔فرشتے، انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان سراپا خواہشات اور جبلت کا قیدی ہے۔وہ اس سے باہر نہیں جا سکتا اور نہ ہی اُس میں یہ صلاحیت موجود ہے۔فرشتہ سراپا اطاعت ہے، اس میں انکار کی صلاحیت نہیں جبکہ انسان کا ہر عمل اُس کے ارادے کے تابع ہے۔اگر انسان اپنا ارادہ اللہ کی مرضی کے تابع کر دے تو فرشتوں سے افضل ہے اور اگر اپنے ارادے کو اپنی خواہش کا تابع کر دے تو جانوروں (حیوانوں) سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

فرشتے جذبات واحساسات سے عاری ہیں۔حیوان جذبات واحساسات کا غیر معتدل استعمال کرتے ہیں اور انسان

تھے رات کے اندھیرے کی جب وہ بدن
ں ہو جائیں، تو مجھ سے آن مل کہ تیرے
ئی ہو۔جیسے لفظ مٹ رہے ہوں جیسے اس
و یاد کیا کیونکہ ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی
ں بدل گیا ہوں اور اس وقت اسے یہ نرالا
سے بہت انھونا نظر آیا اور اس نے درد سے

نف ہو گیا اور الیاسف کو بستی کے خالی اور
ف کھنیچتے تھے۔الیاسف بستی واپس جانے
نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔جھیل
تے چونکا۔یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی
ر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

ہ یوں بھاگا چلا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا
ر اس کی درد کرنے لگی۔پر بھاگتا رہا اور کمر
ور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں
ا ہوا چاروں ہاتھوں پیروں کے بل تیر کے

کے لیے حدِ اعتدال رکھی گئی ہے اور اگر انسان یہ حد پار کر جاتا ہے تو پھر وہ حیوان ہے۔ انتظار حسین کے افسانے کا مفہوم بھی یہی ہے اور مصنف انسان سے حیوان بننے کے عمل میں اسی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔

حدیث نبویؐ ہے ''قہقہہ لگا کر ہنسنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔'' ایک دوسری جگہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''غصہ حرام ہے کیونکہ غصہ انسانی عقل کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو۔'' کہانی میں بندر بننے کے عمل میں غصے اور قہقہے کا حوالہ دیا گیا ہے کہ انسان کی جُون اس وجہ سے بدل گئی:

> ''پھر یوں ہوا کہ ایک دوسرے کو خبر دی کہ العیذر بندر بن گیا ہے۔ اس پر وہ زور سے ہنسا......اور ہنستا ہی چلا گیا حتیٰ کہ اس کا مُنہ سرخ پڑ گیا، دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔''

یا پھر:

> ''زبلون کا مُنہ غصہ سے لال ہو گیا اور وہ دانت پیس کر الیاب پر جھپٹا تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہو گیا۔ ابن زبلون کا چہرہ غصہ سے الیاب کا چہرہ خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا چلا گیا...... پھر وہ بندر بن گئے۔''

افسانے میں انتظار حسین ہمارے سامنے ایک ایسا معاشرہ پیش کرتے ہیں جس میں انسانی قدریں معدوم ہو گئی ہیں، لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو قلب ماہیئت پر راضی ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ان کے لیے یہ تبدیلی تکلیف دہ ہے۔ اس لیے وہ بھی دوسروں جیسے ہی ہیں جو اپنے عمل سے بندر بن چکے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ الیاسف اپنی عقل مندی کی بنیاد پر اپنے عمل کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ سبت کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت میں جو روح کارفرما تھی، اسے نہیں سمجھ سکا کیونکہ اگر ایک چیز چھ دن کے لیے جائز ہے تو ساتویں دن منع کرنے والے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میری بات کی میرے بندوں کی نظر میں کتنی اہمیت ہے!

ارشاد خداوندی ہے کہ:

''وہ لوگ جو آنکھیں رکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔ کان رکھتے ہیں مگر سنتے نہیں۔ زبان رکھتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ یہ انسان نہیں بلکہ چوپائے ہیں بلکہ چوپائیوں سے بھی بدتر ہیں۔'' انتظار حسین یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ احکام خداوندی کی تعمیل اُس کی اصل روح کے ساتھ کی جائے۔

افسانے کا اختتام اس طرح ہوتا ہے جب الیاسف جنگل کی طرف بھاگتا ہے تو بندر کی جُون اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں افسانہ علامتی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ہمارے سامنے ایک ایسا معاشرہ آ جاتا ہے جہاں آخری آدمی بھی جانور بن چکا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں انسان نہیں حیوان بستے ہیں، یہ معاشرہ بستی کے بجائے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان جسے اللہ تعالیٰ نے ''احسن التقویم'' بنایا وہ ''اسفل السافلین'' میں بدل جاتا ہے۔

معبود: خدا، جس کی ع

قریہ: علاقہ

نابود ہونا: غائب ہو

گجردم: صبح سویرے

ٹھٹک جانا: چونک جا

خدوخال: نقش

دانت کچلنا: دانت

دانت بھینچنا: غصے می

مجسم: بکمل، پورا جسم

حلقہ زن ہونا: خوف
زدہ ہونا

بدہیت: بدصورت، بر

تا آنکہ: جب تک

تعاقب: پیچھا کرنا

اُمنڈنے لگا: بے تا

صنوبر: (درخت کا
خوشبو ٹی بی کے مر
ہے۔ یہ درخت
میں بہت زیادہ تعدا
ہیں)

"آخری آدمی"..... فرہنگ

معبود: خدا، جس کی عبادت کی جائے
قریہ: علاقہ
نابود ہونا: غائب ہونا
گجردم: صبح سویرے
ٹھٹک جانا: چونک جانا
خدوخال: نقش
دانت کچلنا: دانت پیسنا
دانت بھینچنا: غصے میں آنا
مجسم: مکمل، پورا جسم
حلقہ زن ہونا: خوف زدہ ہو جانا، حیرت زدہ ہونا
بدہیت: بدصورت، بری شکل، عجیب شکل
تا آنکہ: جب تک کہ
تعاقب: پیچھا کرنا
اُمنڈنے لگا: بے تاب ہونے لگا
صنوبر: (درخت کا نام اس درخت کی خوشبو ٹی بی کے مریض کے لیے مفید ہے۔ یہ درخت بلوچستان، زیارت میں بہت زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں)

صندل: ایک پودا۔ (اس کے پھول کا رس بھی ادویات میں استعمال ہوتا ہے۔ مشروبات میں بھی کام آتا ہے)
چھپرکٹ: بچھونا، چادر
تبت: بیٹی
جون: نسل، شکل، جنس
مبادہ: کہیں ایسا نہ ہو
ہم جنس: ایک ہی نسل یا ہیت سے تعلق رکھنے والے
کنگرہ: ٹکڑا
جھرجھری: کانپنا، ایک جھٹکا لینا
کلکاریاں کرنا: شور مچانا، اٹکھیلیاں کرنا
حقارت: نفرت
کھوے سے کھوا چھلنا: بہت رش ہونا
کینڈے: وضع قطع، ڈیل ڈول
صامن: امن کی جگہ
محاصرہ: گھیرے میں لینا
مدافعت: روکنا، مقابلہ کرنا
معدوم: نہ نظر آنے والا، مٹایا گیا
مکر: فریب، دھوکا

موافق: سازگار
ہراساں کرنا: ڈرانا، پریشان کرنا
یلغار: حملہ
وسوسہ: شک، وہم
گڑگڑانا: رونا، معافی مانگنا
اپنے تئیں: اپنے آپ
دودھیا گھوڑیا: سفید گھوڑیا
خائف: ڈرا ہوا، خوفزدہ
اسی اثناء: اسی وقت
تعاقب: پیچھا

تظار حسین کے افسانے کا مفہوم بھی یہی ہے

جگہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "غصہ حرام ہے
نی میں بندر بننے کے عمل میں غصے اور قہقہے کا

پر وہ زور سے ہنسا......اور ہنستا ہی
نچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔"

چھا تب الیاب پر خوف سے لرزہ
آپ میں سکڑتا چلا گیا...... پھر وہ

یں جس میں انسانی قدریں معدوم ہو گئی ہیں،
جو قلب ماہیئت پر راضی ہیں اور دوسرے وہ جو
وہ بھی دوسروں جیسے ہی ہیں جو اپنے عمل سے
ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ سبت کے
چیز چھ دن کے لیے جائز ہے تو ساتویں دن منع
یت ہے!

نتے نہیں۔ زبان رکھتے ہیں مگر بولتے نہیں۔ یہ
چاہ رہے ہیں کہ احکام خداوندی کی تعمیل اُس کی

گتا ہے تو بندر کی جون اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں
ں آخری آدمی بھی جانور بن چکا ہے۔ ایک ایسا
تبدیل ہو جاتا ہے اور انسان جسے اللہ تعالیٰ نے

بادل

وہ بادلوں کی تلاش میں دور تک گیا۔ گلی گلی گھومتا ہوا کچی کوئیا پہنچا۔ وہاں سے کچے رستے پر پڑ لیا اور کھیت کھیت چلتا چلا گیا۔ مخالف سمت سے ایک گھسیارا گھاس کی گٹھڑی سر پر رکھے چلا آ رہا تھا۔ اسے اس نے روکا اور پوچھا کہ ''اِدھر بادل آئے تھے؟''

''بادل؟'' گھسیارے نے اس تعجب سے کہا جیسے اس سے بہت انوکھا سوال کیا گیا ہو۔

''ہاں بادل۔'' اور جب گھسیارے کی حیرت میں کوئی کمی نہ آئی تو وہ اس سے مایوس ہوا اور آگے چل کر اس نے کھیت میں ایک ہل چلاتے ہوئے کسان سے یہی سوال کیا ''اِدھر بادل آئے تھے؟''

کسان کی سمجھ میں بھی یہ سوال نہ آیا۔ اس نے سٹپٹا کر کہا ''بادل؟''

''ہاں بادل۔''

اصل میں وہ بادلوں کے متعلق ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ڈھونڈنے والا راہ چلتے ہوؤں سے گم ہو جانے والے بچے کے متعلق پوچھتا ہے۔ شاید بادل بھی گمشدہ بچے تھے کہ وہ انہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور ہر راہ چلتے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے آج صبح اس نے اماں جی سے یہ سوال کیا تھا ''اماں جی، بادل کہاں گئے؟''

''کون کہاں گئے؟'' اماں جی نے اس سے ایسے پوچھا جیسے اس نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا۔

''بادل''

''بادل.....ارے تیرا دماغ چل گیا ہے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر اور سکول جا۔''

اماں جی کے اس اندازِ بیان نے اس پر ایک ناخوشگوار اثر چھوڑا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ منہ دھویا، ناشتہ کیا اور کتابوں کا بیگ گلے میں ڈال کر سکول کے لیے گھر سے نکلا مگر گھر سے نکلتے ہی اس کے ذہن میں پھر وہی سوال ابھرا، بادل کہاں گئے؟ اور اس کے ساتھ اسے رات کا وہ وقت یاد آیا جب اس نے بادل امنڈتے گرجتے دیکھے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا۔ اس وقت آسمان بادلوں سے خالی اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور گرمی سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے مشکل سے نیند آئی۔ پھر جانے کیا وقت تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو وقت بھی ہو، اس کے لیے وہ آدھی رات تھی۔ دور آسمان پر بادل ایک گرج کے ساتھ امنڈ رہے

تھے۔ بیچ بیچ میں بجلی چمکتی اور اس چمک میں وہ بادل بہت کالے کالے نظر آتے۔ اسے لگا کہ بہت زور کی بارش آئے گی مگر اس میں نیند کتنی خراب ہوتی ہے۔ بس اسی اندیشے سے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسے ہو گیا جیسے اسے خبر ہی نہیں ہے کہ بادل گرج رہے ہیں' سو گیا۔ صبح جب اٹھا تو حیران رہ گیا۔ آسمان..... آسمان بادلوں سے بالکل خالی تھا اور صحن میں بوندیں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اسے پہلے تعجب ہوا۔ پھر افسوس ہوا۔ تعجب اس پر کہ بادل اتنے امنڈ گھمنڈ آئے تھے اور برسے نہیں۔ پھر گئے کہاں؟ افسوس اس پر کہ وہ سو کیوں گیا۔ جیسے وہ جاگتا رہتا تو بادل آنکھوں سے اوجھل نہ ہو پاتے اور پھر برس کر ہی جاتے۔ وہ بارش ہو جاتی تو موسم کی پہلی بارش ہوتی مگر اس کے سوتے ہوئے بادل گھر کر آئے اور چلے گئے۔ بارش کی کوئی بوند نہیں پڑی۔ برسات کا موسم خالی گزرا جارہا تھا۔ اس نے چلتے چلتے ایک بار پھر آسمان کا جائزہ لیا۔ دور تک کوئی بادل نہیں تھا۔ خالی آسمان میں سورج عین اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ وہ سکول کا راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں نکل گیا۔

کھیتوں کے بیچ پتلی پتلی بٹیوں پر ہوتا ہوا وہ دور نکل گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ اس کا بدن پھنکنے لگا' حلق خشک ہو گیا۔ کئی کھیت پار کرنے کے بعد گھنی چھاؤں والا ایک پیڑ دکھائی دیا کہ اس کی چھاؤں میں کنواں چل رہا تھا۔ گویا ریگستان میں چلتے چلتے نخلستان آ گیا۔ اس نے درخت کی چھاؤں میں پہنچ کر کتابوں کا بیگ ایک طرف رکھا۔ کنویں کے پاس پہنچ کر رہٹ سے نکلتے ہوئے پانی سے پیر دھوئے۔ ہاتھ منہ دھویا اور پھر جی بھر کر پانی پیا۔

منہ ہاتھ دھو کر پانی پی کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور روشنی آئی۔ اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کنویں کے پاس ہی ٹوٹے سے مونڈھے پر ایک بڑے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ آخر اس نے ہمت باندھی اور بولا ''بڑے میاں! اِدھر بادل آئے تھے؟''

بڑے میاں نے حقہ پیتے پیتے اسے غور سے دیکھا' پھر بولے ''بیٹا' بادل چھپ کر تو نہیں آئیں گے۔ جب گھر کر آئیں گے تو آسمان و زمین کو پتہ چل جائے گا۔''

''مگر رات تو بادل آئے تھے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔''

''رات بادل آئے تھے؟'' بڑے میاں نے کچھ سوچا۔ پھر اونچی آواز سے اللہ دین سے مخاطب ہوئے۔ ''اللہ دین رات بادل آئے تھے؟''

اللہ دین بیلوں کو ہانکتے ہانکتے رکا' بولا ''میں تو جی رات کھاٹ پہ پیٹھ لگاتے ہی سو گیا تھا' مجھے پتا نہیں۔''

پھر بڑے میاں بولے۔ ''بیٹا! بادلوں کے خالی آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ایسے علاقے میں رہ چکا ہوں جہاں دس سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔''

''دس سال سے؟'' اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں دس سال سے مگر بادل آتے تھے۔ میں جن دنوں وہاں تھا' ان دنوں بھی ایک دفعہ بادل بہت گھر کے آئے تھے مگر پانی کی ایک بوند نہیں پڑی۔''

ے کچے رستے پر پڑلیا اور کھیت کھیت چلتا چلا
ے روکا اور پوچھا کہ ''اِدھر بادل آئے تھے؟''
ں کیا گیا ہو۔
ے مایوس ہوا اور آگے چل کر اس نے کھیت

ہ چلتے ہوؤں سے گم ہو جانے والے بچے کے
ہر راہ چلتے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے تشفی

دل کہاں گئے؟''
ت احمقانہ سوال کیا تھا۔

نہ کر اور سکول جا۔''
نے بے دلی سے ہاتھ منہ دھویا' ناشتہ کیا اور کتابوں
ن میں پھر وہی سوال ابھرا' بادل کہاں گئے؟ اور
ے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا۔ اس وقت آسمان
ہی تھی۔ اسے مشکل سے نیند آئی۔ پھر جانے کیا
ور آسمان پر بادل ایک گرج کے ساتھ امنڈ رہے

''عجیب بات ہے۔''

''عجیب بات کوئی نہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کا حکم ہوتا ہے تو بادل برستے ہیں' اس کا حکم نہیں ہوتا تو بادل نہیں برستے۔''

بڑے میاں کے اس بیان کے ساتھ ساتھ اس کے تصور میں پچھلی مختلف گھٹائیں اُمنڈ آئیں۔ وہ گھٹائیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے کے ساتھ اٹھیں' جیسے برس کر جل تھل کر دیں گی مگر بوند برسائے بغیر گزر گئیں۔ وہ گھٹائیں جو چند بے معنی سی بدلیوں کی صورت میں آئیں اور ایسی برسیں کہ تال تلیاں اُمنڈ آئیں۔

بڑے میاں نے تپتے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر بڑبڑائے''موسم گزرا جا رہا ہے' پتہ نہیں اس کا حکم کب ہوگا؟''

جواب میں وہ بھی بڑبڑایا''مینہ برستا ہی نہیں۔ پتہ نہیں بادل آ کے کہاں چلے گئے۔''

''بیٹا کیا برسے' برسے گا تو خبریں آنے لگیں کہ سیلاب آ گیا۔ آسمان بخیل ہو گیا۔ زمین میں ظرف نہیں رہا' بارش ہوتی ہی نہیں' ہوتی ہے تو سیلاب اُمنڈ پڑتا ہے۔''

بڑے میاں کی باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آئیں' کچھ نہ آئیں۔ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ کتابوں کا بیگ اٹھائے' گلے میں ڈال اٹھ کھڑا ہوا۔

مٹی' دھول اور دھوپ میں وہ دیر تک چلتا رہا۔ جن راستوں سے آیا تھا' انہی راستوں پر لوٹ رہا تھا۔ دھوپ اب بھی تیز تھی مگر جب وہ کچی کوئیا کے پاس پہنچا تو اسے لگا کہ ہوا میں ایک ٹھنڈی لکیر سی تیر گئی ہے اور قدموں کے نیچے مٹی کچھ سیلی سیلی ہے۔

بستی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رستہ یہاں سے وہاں تک گیلا ہے۔ درخت کہ اس کے جاتے وقت روز کی طرح دھول میں اٹے کھڑے تھے۔ اب نہائے دھوئے نظر آ رہے تھے اور نالہ کہ پچھلی برسات کے بعد سے خشک چلا آ رہا تھا' رواں ہو گیا ہے۔ خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے صحن میں جو جامن کا پیڑ کھڑا ہے' وہ کتنا تر و تازہ ہوا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے فضا کو بارش کے حساب سے بدلا ہوا پایا۔ جامن سے بہت سے پتے نیچے گرے پڑے تھے اور گیلی مٹی میں لت پت تھے۔ باقی درخت نہایا دھویا کھڑا تھا اور اماں جی ایک آسودگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔''اچھی بارش ہوگئی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا تو گرمی سے دم اُلٹنے لگا تھا۔''

جامن کی ٹہنیوں سے بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ وہ پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا اور بوندوں کو اپنے سر پر اور اپنے گالوں پر لیا۔ اس کی نظر آسمان پر گئی۔ آسمان دھلا دھلا نظر آ رہا تھا۔ اب وہاں کوئی بدلی نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بادلوں کی تلاش میں دھوپ اور دھول میں کتنی دور تک گیا اور بادل اس کے پیچھے آئے اور برس کر چلے بھی گئے۔ اس خیال نے اسے اداس کر دیا۔ بارش میں بھیگی ساری فضا اسے بے معنی نظر آنے لگی۔

''بادل''.....تجزیاتی نوٹ

انتظار حسین افسانوی ادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ ایک بلند پایہ افسانہ نگار اور مانے ہوئے ناول نگار ہیں۔ انتظار حسین نے پاکستان بننے سے پہلے لکھنا شروع کیا مگر ان کی تصنیف کا اصل سفر پاکستان بننے کے بعد شروع ہوا۔ انتظار حسین نے تقسیم کا عمل اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا اور پھر پاکستان بننے کے بعد کے مسائل کا بھی مشاہدہ کیا۔ تمام سیاسی منظر نامے ان کے سامنے تبدیل ہوئے۔ سب مارشل لاء انتظار حسین کے مشاہدے میں آئے اور اس طرح ان کا سیاسی' سماجی شعور پختہ ہوتا چلا گیا۔

پاکستان میں زیادہ عرصہ مارشل لاء کا دور دورہ رہا ہے اور اس دوران ادیبوں اور شاعروں کے لیے اظہار رائے پر پابندی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے دوسرے بہت سے مصنفین کی طرح انتظار حسین نے بھی اظہار کے لیے علامت کے راستے کا انتخاب کیا۔

ہمارے نصاب میں شامل انتظار حسین کا افسانہ ''بادل'' بھی مکمل طور پر علامتی افسانہ ہے اور اس میں انسانی نفسیات کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار (جو کہ ایک بچہ ہے) بادلوں کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور ہر ایک سے پوچھتا ہے کہ ''ادھر بادل آئے تھے؟'' یہ ایک ایسا سوال ہے جو پڑھنے والے کے ذہن میں بے شمار سوالات کو جنم دیتا ہے۔ بادلوں کی تلاش اصل میں سکون' آرام اور راحت کی تلاش ہے۔ ذہنی آسودگی کی تلاش ہے۔ خواہشات کی تکمیل کی تلاش ہے۔ ظاہری اور باطنی اطمینان کی تلاش ہے۔ امن کی تلاش ہے۔ تسکین کی تلاش ہے۔ اپنے حقوق کی تلاش ہے۔

انتظار حسین نے اس کردار کے ذریعے انسان کی ذہنی کشمکش کو پیش کیا ہے کہ انسان ہر وقت اپنی ظاہری اور باطنی خواہشات کی تکمیل کے درپے رہتا ہے مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کے لیے تردد کر رہا ہو یا جو چاہ رہا ہو وہ اسے مل بھی جائے۔

بادلوں کا گھر آنا اور بارش برسائے بغیر چلے جانا انسان کی اندرونی گھٹن کی طرف اشارہ ہے اور یہ گھٹن پورے معاشرے کی سوچ میں شامل ہے اور اس کی وجہ وہ ریاستی اور حکومتی جبر ہو سکتا ہے جو کہ پاکستان میں بسے والوں کا مقدر رہا ہے۔ افسانے میں بڑے میاں کی گفتگو بھی بہت معنی خیز ہے اور اُس میں بھی مخصوص اشارے ہیں جیسے ''میں ایک ایسے علاقے میں رہ چکا ہوں جہاں دس سال سے بارش نہیں ہوئی تھی'' دس سال بھی ایک مخصوص اشارہ ہے۔ جیسے پاکستان میں دو فوجی حکمرانوں کا دور تقریباً 10 سال پر محیط رہا ہے۔ پھر افسانے کا مرکزی کردار (جو بادل ڈھونڈ رہا ہے) کی غیر موجودگی میں بارش ہو جانا اور اس کا

بارش سے محروم رہنا بھی اسی دور کی ایک علامت ہے کہ نوازشات یا عنایات ہوتی تو ہیں مگر ان دیکھی ہیں اور وہ لوگ محروم رہ جاتے ہیں جو اُس کی تلاش میں ہوتے ہیں یا اُس کے حق دار ہوتے ہیں۔ بڑے میاں کی زبان سے نکلنے والے دوسرے جملے بھی بہت گہرائی پر مبنی ہیں جیسے:

''آسمان بخیل ہوگیا۔ زمین میں ظرف نہیں رہا۔ بارش ہوتی ہی نہیں، ہوتی ہے تو سیلاب اُمنڈ پڑتا ہے۔''

یہاں انتظار حسین کا اشارہ اس طرف ہے کہ انسانوں کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملتی ہے۔ اللہ کا انعام اُن قوموں کو ملتا ہے جو اس کی حق دار ہوتی ہیں اور آج کے انسان کا ظرف اس قابل نہیں کہ اُسے انعامات سے نوازا جائے۔ پوری گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے ہاں معاشرتی گھٹن نے انسانوں کو ایک عجیب نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں آسکتے چاہے اس کے لیے وہ کوشش بھی کریں تب بھی یہ گھٹن، مایوسی اور بے چینی ان کا مقدر ہے۔

''بادل''.....فرہنگ

انوکھا: عجیب
تشفی: تسلی، اطمینان
اندازِ بیان: بولنے کا انداز
اوجھل: اوٹ میں، چھپے ہوئے
رہٹ: کنواں
دماغ چلنا: پاگل ہو جانا، دماغ فیل ہو جانا
سیلی: نم آلود، گیلی
دھول: مٹی، خاک
بوند: پانی کا قطرہ
کٹیا: جھونپڑی

تعجب: حیرت، حیرانی
احمقانہ: بے وقوفی والا فیصلہ، حماقت
امنڈتے: بڑھتے ہوئے، تیزی سے
نخلستان: مراد کھجور کے درخت، پانچ
کھاٹ: چارپائی
بٹیوں: کھیت کے درمیان چھوٹا راستہ
گھر کر آنا: بادلوں کا بڑھ چڑھ کر آنا
مونڈھا: بیٹھنے کا موڑھا
مینہ: بارش

ں مگران دیکھی ہیں اور وہ لوگ محروم رہ جاتے
بان سے نکلنے والے دوسرے جملے بھی بہت

ہے تو سیلاب اُمنڈ پڑتا ہے۔''
زا یا سزا ملتی ہے۔ اللہ کا انعام اُن قوموں کو ملتا
ات سے نوازا جائے۔ پوری گفتگو کے بعد ہم
کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے جس سے وہ باہر نہیں
قدر ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد

(1832ء.....1910ء)

مولانا محمد حسین آزاد 1832ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آزاد کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا۔ انہوں نے 1837ء میں دہلی سے پہلا اخبار ''اردو اخبار'' نکالا۔ آزاد نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور پھر ذوق سے حاصل کی۔ پھر دلی کالج میں داخل ہو گئے جہاں مولوی نذیر احمد، ذکاءاللہ اور پیارے لال آشوب جیسے جید علما سے کسب فیض کیا۔

1857ء کی جنگِ آزادی کے ہنگاموں میں مولانا آزاد کے والد پر انگریزوں نے بغاوت کا الزام لگا کر پھانسی پر چڑھا دیا۔ انہی ہنگاموں کی بنا پر آزاد دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ آزاد 1864ء میں لاہور آ گئے اور محکمہ تعلیم میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ جب آزاد کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں تو میجر فلر نے انہیں اردو اور فارسی کی درسی کتابیں لکھنے کو کہا۔ پھر کرنل ہالرائیڈ کے توسط سے سرکاری اخبار ''اتالیق پنجاب'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے۔ 1865ء میں آزاد نے کابل (افغانستان) اور بخارا (ایران) کا سفر اختیار کیا جس کی بنا پر آزاد کو فارسی زبان وادب میں مہارت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

1873ء میں جب انجمنِ پنجاب قائم ہوئی تو آزاد اس سے منسلک ہو گئے۔ انجمنِ پنجاب کے ذریعے حالی اور آزاد نے جدید اردو شاعری کی بنیاد رکھی۔ مولانا آزاد نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی عربی اور فارسی کے پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ عمر کے آخری حصے میں جوان بیٹی کی موت کے صدمے نے آزاد کو گہرے دکھ میں مبتلا کر دیا اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ یہ حالت کافی دیر تک قائم رہی اور آخر 1910ء میں محمد حسین آزاد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

آزاد کی نثر میں بھی شاعری کا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ آزاد اپنے تخیل کی بلند پروازی کی بدولت قاری کو اپنے دام میں جکڑ لیتے ہیں جو اُس سے باہر نہیں نکل پاتا۔ وہ نثر میں تشبیہات واستعارات کی بدولت شعریت پیدا کر دیتے ہیں جس سے ان کی نثر دلکش اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ وہ الفاظ کی بازی گری میں مہارت رکھتے ہیں اور یہ چیز ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔

عربی اور فارسی پر عبور ہونے کے باوصف ان کے پاس الفاظ وتراکیب کی کمی نہیں تھی جس سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ آزاد کی نثر میں لطیف جذبات وخیالات، شستہ زبان اور مرقع نگاری کے خوبصورت نمونے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات

عربی کے ثقیل الفاظ اور انگریزی الفاظ کا بلا وجہ استعمال بھی ان کی نثر میں نظر آتا ہے۔

تخیل کی بلندی اور قوتِ متخیّلہ کا زیادہ استعمال ان کی نثر کو طلسماتی اور جادوئی بنا دیتا ہے جس سے تحریر میں حسن اور دلچسپی ضرور پیدا ہوتی ہے مگر وہ زمینی حقائق سے دور نکل جاتے ہیں۔ ہمارے نصاب میں شامل ان کے مضمون ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' میں یہ مثالیں ہمیں نظر آتی ہیں۔

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہلِ دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفہ کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان الافلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ ''تمام اہلِ عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب وتکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔'' چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدانِ خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ میں کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے، مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہا، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا۔ اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن دامنِ قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جناتوں کی تصویریں زردوزی کڑھی ہوئی تھیں اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وغریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقامِ مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں۔ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغہ میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا۔ بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ

ئی بنا دیتا ہے۔ جس سے تحریر میں حسن اور دلچسپی
ل ان کے مضمون ''انسان کسی حال میں خوش

سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سر پر دُودِ آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیرِ خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں۔ کچھ کچھ جدوجہد سے سر ہلا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے، اسی طرح چلے گئے۔ بہت بُڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ کچھ موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبارِ رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع واقسام کے سقم اور وہ امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعہ تھا یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراضِ نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بداطواری[1] پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعفِ جسمانی اور عیوبِ عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شُہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھ کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے۔ ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے مگر انہوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا۔ مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد وقامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا۔ یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہِ پُرآفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے جو

(1) مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بے وقوفی یا بداطواری کو کوئی برا نہیں سمجھتا۔ اسی واسطے اسے کسی نے نہیں پھینکا۔

سلطان الافلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے۔ جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبارِ عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں، وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا، دردِ قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے دردِ مذکور پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دِق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ دردِ قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا دردِ قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

ایک بچارا جہازی ملازم تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے بسور رہا ہے۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لی تھی، وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دِق ہو کر اسے چھوڑا تھا، اب وہ دردِ جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اسی طرح برعکس، غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بیچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے، اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہماری سہار کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا، مگر مثانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بیچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی۔ کھوئے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں، ان کا غول گرد تھا، یہ انہیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔

جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزر جانا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورتحال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بیچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے عرقِ ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہوئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے موٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا' اس نے ایک لمٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا' وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلّیوں پر چلا جاتا ہے۔ سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اٹھاتا تھا مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دو دائرے کھچتے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ ''میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔''

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری' نالہ وفریاد' آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان الافلاک کو بے کس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں۔ پہلے ہی بوجھ انہیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا' وہ شیطانِ نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات وسکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمت الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر وتحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا جو کوہِ مذکورہ خود بخود گھٹنا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لاانتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا''.....تجزیاتی نوٹ

محمد حسین آزاد اردو کے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں۔ان کا اسلوب جداگانہ ہے۔اس اسلوب کو کوئی دوسرا شخص کوشش بھی کرے تو اپنا نہیں سکتا۔یہ صرف آزاد ہی کا خاصا ہے۔کچھ نقادوں نے ان کے اسلوب کو ادب کے عجائبات اور طلسمات کہہ کر پکارا ہے۔آزاد نثر میں شاعری کرتے ہیں۔الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔آزاد لفظی صفت گری کے ماہر ہیں۔زبان کی لطافت، مرقع نگاری اور تصویر کاری اُن کی تحریروں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔

آزاد کی نثر میں تخیل کی بلند پروازی پائی جاتی ہے مگر قوتِ متخیلہ کا استعمال اعتدال کی حدوں کو عبور کر جاتا ہے۔وہ اکثر باتوں کو تخیل کے زور پر طلسماتی اور قدرے حقیقت سے ماورا بنا دیتے ہیں۔ہمارے نصاب میں شامل ان کا مضمون ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا'' ان کے اندازِ تحریر، متخیلہ اور طلسماتی تصورات کی حقیقی تصویر ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں آزاد انسان کے ایک نفسیاتی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں کہ یہ خاک کا پتلا خواہشات کا غلام ہے اور یہ (انسان) زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا اور ہر وقت اپنے مسائل کا دوسروں کے ساتھ موازنہ کرتا رہتا ہے۔انسان فطری طور پر دوسروں کی زندگی پر رشک اور اپنے آپ پر تنقید کرتا رہتا ہے۔مولانا آزاد نے زیرِ نظر مضمون میں انسان کی اس نفسیاتی کشمکش کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

مولانا آزاد ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان قناعت کے بل بوتے پر خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔صوفیا نے بھی عوام کو یہی درس دیا ہے۔ان کے نظریے کے مطابق بھی دنیا میں اطمینان صرف قناعت کی بدولت مل سکتا ہے اور یہی یقین کی منزل ہے۔مولانا آزاد نے یقین کو بڑے اہم ہتھیار کے طور پر مضمون میں استعمال کیا ہے۔

مولانا آزاد مضمون کو خواب کے سہارے طلسمات کی دنیا میں لے گئے ہیں اور خواب کے مناظر بہت ڈرامائی اور دل کو چھونے والے ہیں۔سلطانِ افلاک (مراد اللہ تعالیٰ) کی بارگاہ سے ایک اعلان ہوتا کہ لوگ اپنے غم اور مصیبتیں ایک جگہ پر پھینک جائیں تو لوگ اپنی اپنی مصیبتوں کو اس طرح پھینکتے ہیں کہ ایک جگہ ڈھیر لگ جاتا ہے پھر حکم ہوتا ہے کہ ان مصیبتوں کو اب ان لوگوں میں برابر بانٹ دو اور وہم کو مولانا نے شیطان کے روپ میں دکھایا ہے۔وہ سب کو مصائب برابر بانٹ دیتا ہے۔جب ہر شخص کو اپنی مصیبت کے بدلے میں کوئی دوسری مصیبت مل جاتی ہے تو لوگ اس پر مزید پریشان ہوتے ہیں اور اپنی پہلی مصیبت واپس لینے کی

ہ گزر جانا چاہیے۔چنانچہ اس کی صورتحال
لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو
معلوم ہوا کہ وہ بیچارا میرے ہنسنے سے شرما
ت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔
جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ
ں تھا۔ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے
ں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ان دونوں کو
م تھا گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا
ب دو دو دائرے کھچتے چلے جاتے تھے۔میں
وتو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔''
یکھنے سے ترس آتا تھا یعنی جان سے بیزار
ن گریہ وزاری، نالہ وفریاد، آہ وافسوس سے
یا اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک
تار کر پھینک دیا۔اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ
۔اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے
ا تھا۔اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان
تحمل تھا۔ابھی وہ اس کوہِ مصیبت کے پاس
رہ گیا۔پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی
ھ اٹھاؤ۔ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی
رلا انتہا میں سے اپنا بارِ مصیبت چننا نہ پڑا۔

کوشش کرتے ہیں۔

جب سب لوگ اپنی اپنی مصیبت پھینک رہے ہوتے ہیں آزاد بعض جگہوں پر طنز اور اصلاح سے بھی کام لیتے ہیں جیسے مصیبتیں پھینکنے کے منظر کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ

"میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔"

مولانا آزاد نے مصیبتیں پھینکنے اور لینے کے عمل میں انسانی نفسیات کو دکھایا ہے کہ انسان اگر ایک حیثیت میں ناخوش ہے تو ضروری نہیں کہ اگر اُس کی موجودہ حیثیت بدل جائے تو مطمئن ہو جائے۔ انسان مسلسل بے چین رہتا ہے۔ مضمون میں اپنی پہلی مصیبت واپس لینے کے عمل سے آزاد نے یہ دکھایا ہے کہ انسان ایک دکھ کے ساتھ سمجھوتا کر چکا ہوتا ہے مگر دوسرے دکھ کو وہ ہرگز برداشت نہیں کرتا۔

مضمون میں وہم کو شیطان اور انسان کا دشمن اور صبر کو فرشتہ رحمت دکھا کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صبر ہی انسان کا دوست اور سرمایہ ہے۔ مولانا آزاد یہ درس دینا چاہتے ہیں کہ انسان کو اصل میں اپنے اندرونی عیبوں سے اور روحانی امراض سے چھٹکارہ پانا چاہیے کیونکہ اُس کی بے چینی کی وجہ وہ ہیں۔ یہ ظاہری دکھ اور پریشانیاں تو عارضی ہیں۔ اصل مسئلہ تو انسان کی روحانی صورت حال کا ہے۔

وں پر طنز اور اصلاح سے بھی کام لیتے ہیں جیسے

س کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔"

یا ہے کہ انسان اگر ایک حیثیت میں ناخوش ہے
سلسل بے چین رہتا ہے۔ مضمون میں اپنی پہلی
ر سمجھتا کر چکا ہوتا ہے مگر دوسرے دکھ کو وہ ہرگز

یہ ثابت کیا گیا ہے کہ صبر ہی انسان کا دوست اور
عیبوں سے اور روحانی امراض سے چھٹکارہ پانا
ں۔ اصل مسئلہ تو انسان کی روحانی صورت حال

"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا"..... فرہنگ

سقراط: یونانی فلسفی/حکیم
غنیمت: اہتمام، مناسب سمجھنا
سلطانِ افلاک: آسمانوں کا بادشاہ، مراد خدا
افلاس: غربت
میدانِ خیال: خیال کا پھیلاؤ
سہا: ڈرا ہوا، خوفزدہ
ہوا کی حالت: مراد بہت کمزور
انبار: ڈھیر، کسی چیز کو اکٹھا کر کے رکھنا
دامنِ قیامت: مراد بہت لمبا
وحشیانہ: جیسے دیکھ کر وحشت ہو
انواع واقسام: مختلف قسم کے
چکن: ایک پھولدار کپڑے کا نام
جورو: بیوی
سقم: خرابی، نقص
امراضِ آدم زاد: انسانوں کی امراض/بیماریاں
بداطواری: غلط طور طریقے
پرآفات: مصیبت زدہ
توکل: اللہ پر یقین، بھروسہ
جوع البقرہ: سخت بھوک، جانوروں جیسی بھوک
ضعفِ جسمانی: جسمانی کمزور

عاقب اندیشی: انجام کی فکر، آخرت کی فکر
رنج والم: دکھ، غم
دبلا پا: کمزوری
انبوہ: بھیڑ
زرروزی: سونے کی تاروں سے بنا ہوا کپڑا
افلاس: غربت
دودِ آہ: آہ کا دواں
عارض: گال، رخسار
عیوب عقلی: دماغی مرض، دماغ کے نقائص
وبال: مصیبت
حواس اڑنا: ہوش اڑنا
مستعد: تیار
عوض: بدلہ
عالم ہیولانی: خیالی دنیا، تخیل
قولنج: پیٹ کا درد، انتڑیوں کا درد، جان لیوا درد
لاولد: جس کی اولاد نہ ہو
نابکار: نکما، ناکارہ
دق: تنگ و پریشان، ٹی بی کے مرض کو بھی کہتے ہیں
جہازی: جہاز چلانے والا، ملاح
سرگرداں: حیران پھرنے والا

کوتاہ اندیشی: کم عقلی
مبادلہ: تبادلہ
ہوس ہائے نفسانی: نفسانی خواہشات، لالچ
بدنامی کا ٹیکہ: بدنامی کا داغ
سج دھج: شان وشوکت
ترت پھرت: چستی سے
پیر مرد: بوڑھا آدمی
جان بلب: مرنے کے قریب
املاک: جائیداد
سرشوری: نافرمانی
جھولے: کانپنے کا مرض
غول: گروہ
پانی پانی ہونا: شرمندہ ہونا
تمسخر اڑانا: مذاق اڑانا
لم ڈھینگ: لمبے قد والا
دمڑی: چوتھائی
نالہ وفریاد: رونا، فریاد کرنا
عرقِ ندامت: شرمندگی کا پسینہ
چھدرا کر: لنگڑا کر
گریہ وزاری: آہ وبکا، رونا
ثلث: ایک تہائی

مرزا فرحت اللہ بیگ

(1888ء....1947ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ 1888ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام حشمت بیگ تھا۔ فرحت اللہ بیگ نے ابتدائی تعلیم دلّی سے حاصل کی اور بی۔اے کرنے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد چلے گئے۔ فرحت اللہ بیگ نے جب گریجویشن کی ڈگری حاصل کی تب بی۔اے کی ڈگری خال خال لوگوں کے پاس ہوتی تھی۔ حیدر آباد میں فرحت مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔

قیامِ حیدر آباد کے دوران مرزا فراحت اللہ بیگ نے یہاں کی ادبی محافل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یوں اُن کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔ فرحت کو لکھنے کا شوق ابتدا ہی سے تھا اور حیدر آباد کے ادبی ماحول میں اس میں پختگی اور برجستگی آ گئی۔ فرحت کا پہلا مضمون عصمت بیگ کے فرضی نام سے چھپا تھا۔ اگرچہ فرحت نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا جس میں تاریخ، تحقیق اور سوانح نگاری بھی شامل ہے مگر فراحت طبعاً خوش مزاج انسان تھے اس لیے ان کی تحریروں میں مزاح کا عنصر نمایاں رہا۔ فرحت کی مزاح نگاری میں ایک لطیف سا طنز بھی پایا جاتا ہے مگر وہ بڑے شستہ انداز سے طنز کا نشتر چبھو کر آگے نکل جاتے ہیں۔

فرحت نے مزاح کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں کو موضوع بحث بنایا اور ان کے مزاح میں اصلاحِ معاشرہ کا پہلو بھی موجود ہے۔ ہمارے نصاب میں شامل اُن کا مضمون ''مردہ بدست زندہ'' اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بے شمار مضامین عوام میں مقبول ہوئے۔ ان مضامین میں ''دہلی کا یادگار مشاعرہ''، ''نذیر احمد کی کہانی''، ''پھول والوں کی سیر'' اور ''نئی اور پرانی تہذیب کی ٹکر'' شامل ہیں۔ انہیں مضامین کی بدولت فرحت نے اردو ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ ان کے یہ مضامین جب تک پڑھے جاتے رہیں گے فرحت کا نام بھی اردو ادب کے اُفق پر چمکتا رہے گا۔

فرحت کے مضامین میں انشائیے کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے کئی شخصیات کے خاکے بھی لکھے۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ میں نے بزرگوں کے واقعات، اہل قلم کے احوال اور اردو زبان کی اصلاح کو اپنے مضامین میں نمایاں جگہ دی۔

فرحت کا اسلوب سادہ مگر شگفتہ ہے۔ وہ نفیس خیالات و جذبات کو لطیف پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اُن کا مزاح قاری پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے اور پڑھنے والے کے چہرے پر زیرِ لب

مسکراہٹ موجود رہتی ہے۔ جب فرحت طنز کرتے ہیں تو اُس میں ان کے اسلوب کی خصوصیات مٹتی ہوئی نظر آتی ہیں۔فرحت کی زبان میں دلّی کا لہجہ جھلکتا ہے اور وہ محاورات اور تشبیہات سے اپنی تحریر کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔فرحت اللہ بیگ کا یہ کمال ہے کہ وہ ایک بے جان موضوع میں بھی جان ڈال دیتے ہیں اور اپنی شگفتہ مزاجی اور زبان کے چٹخارے کے ساتھ ہر موضوع کو دلچسپ بنانے کے گر سے واقف ہیں۔

فرحت کے نزدیک ظرافت پھکڑّ پن اور مسخرہ پن نہیں بلکہ ظرافت لطیف جذبات اور احساسات کا نام ہے۔ایک مزاح نگار سماجی برائیوں کو احسن اور مہذب طریقے سے بھی بیان کرسکتا ہے اُسے بھانڈ بننے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

نام حشمت بیگ تھا۔فرحت اللہ بیگ نے
رآباد چلے گئے۔فرحت اللہ بیگ نے جب
تھی۔حیدرآباد میں فرحت مختلف عہدوں پر

یں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یوں اُن کے ادبی
س میں پختگی اور برجستگی آ گئی۔فرحت کا پہلا
یا جس میں تاریخ، تحقیق اور سوانح نگاری بھی
عنصر نمایاں رہا۔فرحت کی مزاح نگاری میں
جاتے ہیں۔
ران کے مزاح میں اصلاحِ معاشرہ کا پہلو بھی
زندہ مثال ہے۔فرحت اللہ بیگ کے بے شمار
ی کہانی''، ''پھول والوں کی سیر'' اور ''نئی اور
یں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ان کے یہ
رہے گا۔
صیات کے خاکے بھی لکھے۔وہ خود اس بات کا
اصلاح کو اپنے مضامین میں نمایاں جگہ دی۔
یرائے میں بیان کرتے ہیں اور پڑھنے والے
تا ہے اور پڑھنے والے کے چہرے پر زیرِ لب

مردہ بدستِ زندہ

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیاداری ہی دنیاداری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازے کے ساتھ جانا اب رسما رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ ''واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا یہ دم بھرا جاتا تھا' مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا۔'' اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آیئے میرے ساتھ آیئے' آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجیے' سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں' گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں' امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں' کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازے میں کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے' وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے؟ ''کیا مر گئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے۔'' اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہو چکا۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے کی شکایت ہوئی۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں۔ ملک کی خبروں پر رائے زنی ہوئی۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ پہنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا۔ یہ دیکھتے ہی دروازے کی بھیڑ چھنٹ گئی۔ کچھ اِدھر ہو گئے' کچھ اُدھر۔ آگے آگے جنازہ ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ جن کو پیچھے رہنا تھا' انہوں نے چال آہستہ کر دی' جنہیں ساتھ جانا تھا' وہ ذرا تیز چلے۔ غرض ہوتے ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے۔ آگے تو وہ رہے جو مرنے والے کے عزیز تھے یا جن کو جنازہ اٹھانے کے لیے اجرت پر بلایا گیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے پاس یا تو سواریاں نہ تھیں یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب سمجھتے تھے۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہٹتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہو گیا۔ اگر پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدیدار ہیں تو غرض مندوں

سے ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں۔ایک آیا' جھک کر سلام کیا۔گھر بھر کی مزاج پرسی کی۔مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے۔ اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹر کی برائیاں کیں' اگر حکیم کے علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں اور اسی سلسلے میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے۔ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انہوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے۔ غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے۔ یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے۔ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کر کپڑے بدل کر خاص اسی جنازے کے لیے آئے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے۔دور سے مسجد کو دیکھا اور انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار' کسی موڑ یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی۔ یہ وہیں کھڑے ہو گئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انہوں نے وقت گزار دیا۔ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے۔اُدھر نماز ختم ہوئی' اِدھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے۔اُدھر جنازہ نکلا' اِدھر یہ پہنچے۔بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں۔

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا' اب راستے والوں کی سنیے۔اگر میت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوں تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ آئے' مرنے والے کا نام پوچھا' مرض دریافت کیا اور واپس ہو گئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے کو آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں۔موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو۔یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انہیں کے لیے بنی ہیں۔ کسی جنازے کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو' موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول کا نقصان ہے۔کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے۔شوفر ہے کہ ہارن پر ہارن بجا رہا ہے' لوگ ہیں کہ اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی ہے اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔ یہ لوگ تو وہ ہیں کہ قیامت آئے گی تو ان کو بھی ہارن بجا بجا کر سامنے ہٹانے کی فکر کریں گے۔ خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا۔

قبرستانوں کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے' کم ہے۔ جائے عبرت کو جائے وحشت بنا دیا ہے۔قبرستان کیا ہے' خاصا ایک جنگل ہے۔ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی ہے' اس میں ایک سقے صاحب' ان کی بیوی' دس بارہ بچے' پانچ چھ بکریاں' ایک لنگڑا ٹٹو' سو دو سو مرغیاں' پانچ چھ بلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیات بھرے پڑے ہیں۔جس حصے میں قبریں ہیں' وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر کمر ہو گئی ہے۔ دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں۔نیم' پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ کر نکل آئے ہیں۔کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے' کسی کا تعویذ ہی غائب ہے۔ کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہو گئی ہیں۔غرض کسمپرسی نے اس حصے کی عجیب حالت کر دی ہے۔دوسرا حصہ جس میں قبریں نہیں ہیں' وہ کس قدر

صاف ہے اور کیوں نہ ہو۔ پہلے حصے کا مردوں سے تعلق ہے اور دوسرے کا زندوں سے۔ مردے تو اپنی قبر کی مرمت کرنے یا کرانے سے رہے۔ ان کے جو عزیز ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس فضول چیز پر کون کچھ خرچ کرے۔ جن کی زمین ہے وہ تو روپے کھرے کر چکے' اب ان کو اس سے کیا تعلق۔ دوسرے حصے کا صاف رکھا جانا اصول تجارت پر مبنی ہے۔ جب گاہکوں کو گھیرنے کے لیے دکاندار اپنی ایک ایک چیز جھاڑ پونچھ کر رکھتا ہے تو یہ قبرستان والے اپنی پچاس روپے گز والی زمین کو کیوں صاف نہ رکھیں۔ خریدتے وقت اچھا مال دیکھ لو' پھر تم جانو اور تمہارے مردے جانیں۔

میاں سقہ رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ اِدھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیئے۔ خیر کیا حرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا' مردے بھی خوش ہو گئے۔ اس گھر میں سل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مسالا پیس لیا۔ اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ کر جھونپڑی کے پاس لا رکھا۔ بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں۔ مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں' بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں۔ بچیاں قبروں پر بیٹھی اینٹیں اور ٹھیکرے پیس رہی ہیں۔ کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے۔ اس پر بی سقنی نے گیہوں سکھانے ڈال دیئے ہیں۔ ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں پر گھاس چرتی پھرتی ہے۔ اس کے اِدھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری' کسی کا چونا گرا' کسی کا پتھر گرا۔ اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیئے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلے کے بعد کانگڑے کا ہو گیا تھا۔

جنازہ قبرستان میں کیا گیا' فوج میں ٹرم بج گیا۔ سقے کا سارا خاندان اپنا اپنا کام چھوڑ' جھونپڑی میں گھسا اور اناج لینے کو برتن لے' لائن باندھ کر آ بیٹھا۔ کسی کے ہاتھ میں بے پیندے کا تام چینی کا کٹورا ہے تو کسی کے پاس ٹوٹی رکابی' کسی کے پاس مٹی کا پیالہ ہے تو کسی کے ہاتھ میں ٹوٹا ہوا چھاج۔ سچ ہے خدا رازق ہے۔ قبرستان والوں کو بھی گھر بیٹھے رزق پہنچاتا ہے۔

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی۔ اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیے۔ جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا۔ ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے۔ دوسرا آتا ہے' جھانک جاتا ہے۔ ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے۔ کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے۔ کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے۔ کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے۔ جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے۔ چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے۔ کسی نے سقے سے چلم بھرنے کی فرمائش کی۔ اس نے حقہ تازہ کر سلفہ بھر حاضر کیا۔ حقے مزے لے لے کر پیے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی تواضع کی جا رہی ہے۔ سلفے پر سلفہ بھروایا جا رہا ہے اور یہ وقت کسی نہ کسی طرح کاٹا جاتا ہے۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں۔

بعض لوگ ہیں کہ گھاس سے بچتے بچاتے' قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ کون ہیں؟ یہ وہ صاحب جن کے مرے ہوئے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں۔ یوں تو خدانخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے' آج شرماشرمی قبرستان میں آ گئے

ہیں۔مفت کرم داشتن کی صورت ہے۔ چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا۔

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں۔ کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں۔کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے دادِسخن گوئی دی گئی۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا' کچھ ان کا سنا۔غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کو نکال ہی لیا۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں' ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک کانگریس کا اجلاس۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں' وعدے لیے جا رہے ہیں۔غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا۔ ایک نے میت کے اوپر کی چادر سمیٹی۔ چادر میں بل دیئے۔ دو صاحبوں نے مٹھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا' آٹھ دس نے غل مچایا۔ ''سنبھال کے' سنبھال کے۔ میت بھاری ہے' کمر کے نیچے چادر دو۔ ارے میاں! اپنی طرف گھسیٹو' ہاں آہستہ سے' آہستہ سے۔'' اب میت قبر کے منہ تک آ گئی۔فقیروں یا یوں کہو کہ مفت خوروں کو اناج تقسیم ہونے لگا اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے' انہوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا۔کوئی کہتا ہے'' ذرا کمر کی چادر کھینچو' ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے۔دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے۔ ہاں' ہاں ذرا اور جھکا کر' لا الہ الا اللہ میت بھاری ہے ذرا سنبھال کے' آہستہ آہستہ۔بس بھئی بس۔'' کوئی چیخ رہا ہے'' مٹھے کے بندھن کھول دو' ارے میاں! لو یہ ڈھیلا لو۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلے کی طرف تو کر دو' واہ بھئی واہ' اتنا بھی نہیں آتا۔ابھی منہ پورا نہیں پھرا' بس بھئی بس۔''

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے۔ جو بیچارے قبر میں اترے ہیں' وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں' کیا نہ کریں۔ بہر حال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا ہی دیتے ہیں۔اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے۔اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے۔کوئی کہتا ہے۔'' یہ کڑی نہیں' وہ کڑی لو۔'' کوئی کہتا ہے'' لاحول ولاقوۃ' مفت میں سو روپے مار لیے اور کڑیاں دیں تو ایسی۔'' غرض کوئی کچھ کہتا ہے' کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے۔ مٹی تو ہر ایک دیتا ہے' منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے' وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں۔البتہ لفظ'' منہا'' بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ جب کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہو گئی تو فاتحہ کی نوبت آتی ہے۔ ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو۔ ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہیں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی۔ یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں

اوران کی کیا حالت ہے۔ہاں ان بیچاروں کو گھیرتے ہیں تو جنازہ لانے والے مزدور۔گھر سے چکا کرلائے تھے مگر یہاں آکر وہ بھی پاؤں پھیلاتے ہیں۔کبھی تو کہتے ہیں کہ ''فاصلہ بہت تھا'' کبھی کہتے ہیں کہ ''آپ کی وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کرآئے ہیں' وہاں آپ کے ہاں سے دگنا مل رہا تھا۔'' بہرحال ان مصیبت زدوں کو دق کر کے یہ مزدور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔

دیکھ لیا آپ نے اس زمانے کی میت کا رنگ۔جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ ان بندوں کو نیک ہدایت دے' ان کے دل میں درد پیدا کرے۔یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کررہے ہیں؟

''مُردہ بدست زندہ''.....تجزیاتی نوٹ

فرحت اللہ بیگ مضمون نگار ہیں اور مزاحیہ مضمون نگاری میں فرحت کا کوئی ثانی نہیں۔فرحت کے مضامین پُرلطف مزاح اور لطیف طنز سے بھرپور ہوتے ہیں۔وہ اپنے مضامین کے حوالے سے لکھتے ہیں۔میں نے بزرگوں سے سنے ہوئے واقعات اور اردو زبان کی اصلاح کرنے والے اہلِ قلم کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا۔اس کے علاوہ مضامین میں خوش مذاقی کے ساتھ معاشرتی اصلاح کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھا۔

ہمارے نصاب میں شامل اُن کا مضمون ''مُردہ بدست زندہ'' معاشرتی اصلاح کے حوالے سے ہے۔اس مضمون میں انہوں نے ایک نہایت حساس اور انوکھے موضوع کا انتخاب کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں فرحت نے لطیف مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کے نشتر چبھوتے ہوئے ہمارے سماجی' مذہبی' اخلاقی اور ثقافتی رویوں کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور ہمارے رویوں پر کڑی تنقید کی ہے۔

مصنف یہ بتانا چاہتا ہے کہ رشتوں اور تعلقات میں خلوص ختم ہو گیا ہے۔محبت جاتی رہی ہے صرف ظاہرداری رہ گئی ہے۔وہ مضمون کے آغاز میں ہی لکھتے ہیں کہ

> ''زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔سچی محبت کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔اب نہ کوئی سچے دل کے ساتھ کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک اسی درد کے ساتھ جاتا ہے.....
> پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا جیسے کوئی اپنا عزیز مر گیا ہے اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو معلوم ہوتا ہے غیر مر گیا۔''

اس ساری صورتِ حال کو فرحت نے ایک جنازے کے احوال میں بڑے دلچسپ اور طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون میں جنازہ اٹھنے سے پہلے کے مناظر' جنازہ اٹھانے' مسجد تک لے جانے' نمازِ جنازہ پڑھنے اور پھر قبرستان تک کے سفر اور پھر قبرستان میں' ہر جگہ بڑے مدلل انداز میں انسانی رویوں کی تصویر کشی کی ہے۔مضمون پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس سارے عمل میں شامل ہے۔

مضمون میں کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرحت نے زیبِ داستان کے لیے کچھ مبالغے سے کام لیا ہے جیسے ''شوفر

ھر سے چکا کر لائے تھے مگر یہاں آ کر وہ بھی
ں وجہ سے دوسری میت کو چھوڑ کر آئے ہیں'
ور کچھ زیادہ ہی لے مرتے ہیں۔
یح نکلا یا نہیں؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں
یدا کرے۔یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں؟ اور ہم

ہے کہ ہارن پہ ہارن بجا رہا ہے' لوگ ہیں کہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں' جنازہ ہے کہ ٹیڑھا ترچھا ہو رہا ہے' مگر موٹر والے صاحب کی موٹر جس رفتار سے آ رہی تھی اسی رفتار سے نکلے گی اور ضرور نکلے گی۔'' سقن کا قبروں کے پتھروں پر مسالہ پیسنا وغیرہ مگر جب کسی رویے پر طنز کی جائے تو مصنف کو اتنی ڈھیل دینی پڑے گی۔

مضمون کی تفصیلات میں مشاہدے کی گہرائی' جزئیات نگاری اور مصنف کی معلومات کی داد دینی پڑے گی۔ مثلاً

''ٹٹوانی (گھوڑی) کو ایک اگلی ٹانگ اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے۔ وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہے۔''

اس کے علاوہ قبر کھودنے اور اس پر تبصرہ کرنے والوں کا احوال' جنازے کے ساتھ جانے والوں کا رویہ' جنازہ باہر آنے سے پہلے لوگوں کا رویہ اور امیر غریب کی تقسیم' قبر کی تیاری کے وقت لوگوں کا قبروں پر بیٹھ کر عمومی بلکہ ذاتی باتیں کرنے کا احوال' قبروں کے کتبے پڑھنے والوں کا ذکر' قبرستان کی خستہ حالی' مردے کو قبر میں ڈالنے کا منظر اور لوگوں کا رویہ' یہ سب وہ احوال اور تصویریں ہیں جنہیں ہم آئے دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور مقامِ عبرت سمجھنے کے بجائے ان رویوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ فروحت نے ان تمام رویوں پر تنقید اور طنز کرتے ہوئے ہماری اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مضمون چونکہ نصف صدی پہلے کا لکھا ہوا ہے اس لیے کچھ اصطلاحیں طلبا کے لیے نئی ہوں گی کیونکہ آج یہ متروک ہو چکی ہیں جیسے سل بٹے پر مسالہ پیسنا وغیرہ۔

مصنف نے تمام جزئیات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور تصور پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

''مردہ بدست زندہ''.....فرہنگ

تعزیت: غم میں شرکت کرنا
ظاہر داری: دکھاوا، نمائش
رائے زنی: مشورہ دینا، رائے دینا
غرض مند: ضرورت مند، حاجت مند
طبابت: مراد علاج کرنا
وضع داری: روا ، پسندی، تکلف کرنا، اہتمام
تفویض کرنا: سونپنا، حوالے کرنا
جائے عبرت: عبرت کی جگہ، سبق حاصل کرنا
سقہ: پانی بھرنے والا، ماشقی، یہاں گورکن مراد ہے
بلیات: آفات، مصائب، تنگی
کسمپرسی: غریبی
سقّی: سقہ کی مونث، پانی بھرنے والی
ترم: بگل
ریویو: جائزہ
خفتگانِ خاک: زیرِ زمین سونے والے، مردہ
دم بھرنا: دعویٰ کرنا
رنج: دکھ
اُجرت: مزدوری، معاوضہ
ہمراہی: ساتھ چلنے والا
حیات و ممات: زندگی اور موت
موٹرنشین: گاڑیوں میں سوار
لنگڑا ٹٹو: لنگڑا گھوڑا
تعویز: کتبہ، قبر کا اٹھا ہوا حصہ
جائے وحشت: وحشت کی جگہ، خوف کی جگہ، مراد قبرستان
سل بٹا: چوڑا پتھر جس پر مسالہ پیستے ہیں
ٹٹوانی: ٹٹو کی مادہ، گھوڑی
سُلفہ: چلم میں تمباکو بھرنا
کٹورا: پیالہ، دھات کا بنا ہوا پیالہ
چھاج: غلہ پھٹکنے والا، سرکنڈے کا بنا ہوا اوزار
لب گور: قبر کے منہ پر، کنارے پر
گاؤ تکیہ: بڑا تکیہ، گول تکیہ
تواضع: خدمت
دادِ سخن: شعر کی داد
متمکن: بے فکر، قائم، مضبوطی سے بیٹھنے والا
کانگریس: ہندوستان کی سیاسی جماعت
تردید: رد کرنا، کاٹنا، نہ ماننا
پاکھا: پہلو، ایک حصہ دیوار
اَعزہ: عزیز، رشتہ دار، پارلیمنٹ، مجلس وزیروں کی کمیٹی
تنقیح: صاف کرنا
عود: ایک لکڑی جو جلنے میں خوشبو دیتی ہے
مٹھہ: دستہ، پکڑنے کی جگہ، کفن کے ایک سرے کو کہتے ہیں
چبوترہ: اونچی ہموار جگہ، تھڑا
حرج: نقصان
منہا کرنا: نکالنا، تفریق کرنا

احمد شاہ بخاری پطرس

(1898ء-1958ء)

سید احمد شاہ بخاری پطرس 1898ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ پطرس کے والد سید اسد اللہ شاہ پیشے کے لحاظ سے وکیل کے منشی تھے۔ پطرس نے ابتدائی تعلیم پشاور سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ پطرس زمانہ طالب علمی میں ہی شعروادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور گورنمنٹ کالج کے میگزین ''راوی'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ایم اے انگلش کرنے کے بعد پطرس انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ پطرس کی ذہانت سے اُس کے غیر ملکی اساتذہ بھی بہت متاثر تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ کسی غیر ملکی کا انگریزی ادب پر اس قدر عبور قابلِ ستائش ہے۔

انگلستان سے واپس آ کر پطرس نے سنٹرل ٹریننگ کالج اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے اور سات سال تک بطور ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو کام کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1950ء میں آپ کو اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا مستقل نمائندہ بنا کر بھیج دیا گیا۔ 1954ء تک اس عہدے پر کام کیا۔ 1955ء میں اقوامِ متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی ڈائریکٹر منتخب ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ آپ 1957ء میں اس عہدے سے ریٹائر ہو کر کولمبیا یونیورسٹی میں بطور پروفیسر کام کرتے جس کے لیے آپ نے حامی بھر لی تھی مگر فرشتہ اجل نے آپ کو اس کی مہلت نہ دی اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

احمد شاہ بخاری پطرس کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ آپ ایک بلند پایہ نقاد، انشا پرداز تھے۔ پطرس کی ملازمت کی مصروفیات اس قدر زیادہ رہیں کہ شعروادب میں زیادہ طبع آزمائی نہ کر سکے، مگر جو بھی لکھا خوب لکھا اور انہوں نے معیار پر کبھی سودے بازی نہیں کی۔ پطرس نے اپنے مضامین میں زندگی کی ناہمواریوں کا بڑی ذہانت اور ایک فنکار کی حیثیت سے ذکر کیا اور زبان پر مکمل عبور ہونے کے باعث پطرس نے مضامین کو وہ معیار بخشا جو ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ پطرس ایک بلند پایہ مزاح نگار کی طرح اپنے آپ پر بھی ہنستے ہیں اور دوسروں کی کمزوریوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

پطرس کے مضامین صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے یا تمسخر پیدا کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ پطرس معاشرتی ناہمواریوں کو بڑے ہمدردانہ انداز میں دیکھتے ہیں اور وہ ان برائیوں کو دور کرنے کے درپے نظر آتے ہیں اور پطرس اپنی مہارت سے ایسی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں جو ہنسنے پر مجبور کر دے۔ ان کے ہاں طنز بہت کم پایا جاتا ہے بلکہ ظرافت ہی ظرافت ہے اور اگر کہیں طنز کا شائبہ ہے تو بہت لطیف ہے۔

ہمارے نصاب میں شامل ان کا مضمون ''ہاسٹل میں پڑھنا'' ان کے مشہور مضامین میں سے ہے۔ جس میں انہوں نے اقامتی درسگاہوں اور ان کے بارے میں عوام کے نظریات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کے اہم مضامین ''مرحوم کی یاد میں''، ''سویرے جو کل آنکھ میری کھلی''، ''کتے'' شامل ہیں جو آج بھی خاص و عام میں یکساں مقبول ہیں۔

لد سید اسد اللہ شاہ پیشے کے لحاظ سے وکیل
کالج لاہور سے ایم اے کا امتحان امتیازی
ور گورنمنٹ کالج کے میگزین ''راوی'' کے
یورسٹی سے انگریزی ادب میں اعلیٰ ڈگری
ئے یہ تھی کہ کسی غیر ملکی کا انگریزی ادب پر

لج لاہور میں انگریزی ادب کے استاد کی
ئے اور سات سال تک بطور ڈائریکٹر آل
نسپل مقرر ہوئے۔ 1950ء میں آپ کو
پر کام کیا۔ 1955ء میں اقوامِ متحدہ کے
س عہدے سے ریٹائر ہو کر کولمبیا یونیورسٹی
آپ کو اس کی مہلت نہ دی اور وہ اپنے

ل تھی۔ آپ ایک بلند پایہ نقاد، انشا پرداز
آزمائی نہ کر سکے، مگر جو بھی لکھا خوب لکھا
گی کی ناہمواریوں کا بڑی ذہانت اور ایک
و وہ معیار بخشا جو ہر کسی کے حصے میں نہیں
ں کی کمزوریوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

ہاسٹل میں پڑنا

ہم نے کالج میں تعلیم تو ضرور پائی اور رفتہ رفتہ بی اے بھی پاس کرلیا، لیکن اس نصف صدی کے دوران جو کالج میں گزارنی پڑی۔ ہاسٹل میں داخل ہونے کی اجازت ہمیں صرف ایک ہی دفعہ ملی۔

خدا کا یہ فضل ہم پر کب اور کس طرح ہوا یہ سوال ایک داستان کا محتاج ہے۔ جب ہم نے انٹرنس پاس کیا تو مقامی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب خاص طور پر مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ قریبی رشتہ داروں نے دعوتیں دیں۔ محلے والوں میں مٹھائی بانٹی گئی اور ہمارے گھر والوں پر یک لخت اس بات کا انکشاف ہوا کہ وہ لڑکا جسے آج تک اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے ایک بیکار اور نالائق فرزند سمجھتے رہے تھے، دراصل لامحدود قابلیتوں کا مالک ہے۔ جس کی نشوونما پر بے شمار آنے والی نسلوں کی بہبودی کا انحصار ہے۔ چنانچہ ہماری آئندہ زندگی کے متعلق طرح طرح کی تجویزوں پر غور کیا جانے لگا۔

تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی نے ہم کو وظیفہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ ہمارے خاندان نے خدا کے فضل سے آج تک کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اس لیے وظیفے کا نہ ملنا خصوصاً ان رشتہ داروں کے لیے جو رشتے کے لحاظ سے خاندان کے مضافات میں بستے تھے، فخر ومباہات کا باعث بن گیا۔ اور ''مرکزی رشتے داروں'' نے تو اس کو پاس وضع اور حفظ مرتب سمجھ کر ممتحنوں کی شرافت ونجابت کو بے انتہا سراہا۔ بہرحال ہمارے خاندان میں فالتو روپے کی بہتات تھی۔ اس لیے بلاتکلف یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ نہ صرف ہماری بلکہ ملک وقوم اور شاید بنی نوع انسان کی بہتری کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ہونہار طالب علم کی تعلیم جاری رکھی جائے۔

اس بارے میں ہم سے بھی مشورہ کیا گیا۔ عمر بھر میں اس سے پہلے ہمارے کسی معاملے میں ہم سے رائے طلب نہ کی گئی تھی۔ لیکن اب تو حالات بہت مختلف تھے۔ اب تو ایک غیر جانبدار اور ایماندار منصف یعنی یونیورسٹی ہماری بیداری مغزی کی تصدیق کرچکی تھی۔ اب بھلا ہمیں کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ ہمارا مشورہ یہ تھا کہ ہمیں فوراً ولایت بھیج دیا جائے۔ ہم نے مختلف لیڈروں کی تقریروں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کا طریقہ تعلیم بہت ناقص ہے۔ اخبارات میں سے اشتہار دکھا دکھا کر یہ واضح کیا کہ ولایت میں کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فرصت کے اوقات میں بہت تھوڑی تھوڑی فیس دے کر بیک وقت جرنلزم، فوٹو گرافی، تصنیف وتالیف، دندان سازی، عینک سازی، ایجنٹوں کا کام غرضیکہ بے شمار مفید اور کم خرچ بالانشیں پیشے سیکھے جاسکتے ہیں۔ اور

تھوڑے عرصے کے اندر انسان ہر فن مولا بن سکتا ہے۔

لیکن ہماری تجویز کو فوراً رد کر دیا گیا۔ کیونکہ ولایت بھیجنے کے لیے ہمارے شہر میں کوئی روایات موجود نہ تھیں۔ ہمارے گرد و نواح میں کسی کا لڑکا ابھی تک ولایت نہ گیا تھا اس لیے ہمارے شہر کی پبلک وہاں کے حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔

اس کے بعد پھر ہم سے رائے طلب نہ کی گئی اور ہمارے والد ہیڈ ماسٹر صاحب اور تحصیلدار صاحب ان تینوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں لاہور بھیج دیا جائے۔

جب ہم نے یہ خبر سنی تو شروع شروع میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی۔ لیکن جب ادھر ادھر کے لوگوں سے لاہور کے حالات سنے، تو معلوم ہوا کہ لندن اور لاہور میں چنداں فرق نہیں۔ بعض واقف کار دوستوں نے سینما کے حالات پر روشنی ڈالی۔ بعض نے تھیٹروں کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ بعض نے ٹھنڈی سڑک وغیرہ کے مشاغل کو سلجھا کر سمجھایا۔ بعض نے شاہدرے اور شالامار کی ارمان انگیز فضا کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ جب لاہور کا جغرافیہ پوری طرح ہمارے ذہن نشین ہو گیا تو ثابت یہ ہوا کہ خوشگوار مقام ہے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بے حد موزوں۔ اس پر ہم نے اپنی زندگی کا پروگرام وضع کرنا شروع کر دیا۔ جس میں لکھنے پڑھنے کو جگہ تو ضرور دی گئی، لیکن ایک مناسب حد تک، تاکہ طبیعت پر کوئی ناجائز بوجھ نہ پڑے اور فطرت اپنا کام حسن و خوبی کے ساتھ کر سکے۔

لیکن تحصیلدار صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی نیک نیتی یہیں تک محدود نہ رہی۔ اگر وہ ایک عام اور مجمل سا مشورہ دے دیتے کہ لڑکے کو لاہور بھیج دیا جائے تو بہت خوب تھا۔ لیکن انہوں نے تو تفصیلات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ اور ہاسٹل کی زندگی اور گھر کی زندگی کا مقابلہ کر کے ہمارے والد پر یہ ثابت کر دیا کہ گھر پاکیزگی اور طہارت کا ایک کعبہ اور ہاسٹل گناہ و معصیت کا ایک دوزخ ہے۔ ایک تو تھے وہ چرب زبان اس پر انہوں نے بے شمار غلط بیانیوں سے کام لیا۔ چنانچہ گھر والوں کو یقین سا ہو گیا کہ کالج کا ہاسٹل جرائم پیشہ اقوام کی ایک بستی ہے اور جو طلبا باہر کے شہروں سے لاہور جاتے ہیں اگر ان کی پوری طرح نگہداشت نہ کی جائے تو وہ اکثر شراب کے نشے میں چور سڑک کے کنارے کسی نالی میں گرے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ یا کسی جوئے خانہ میں ہزار ہا روپے ہار کر خودکشی کر لیتے ہیں یا پھر فرسٹ ایئر کا امتحان پاس کرنے سے پہلے دس بارہ شادیاں کر بیٹھتے ہیں۔

چنانچہ گھر والوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ لڑکے کو کالج میں تو داخل کیا جائے لیکن ہاسٹل میں نہ رکھا جائے۔ کالج ضرور مگر ہاسٹل ہرگز نہیں۔ کالج مفید مگر ہاسٹل مضر۔ وہ بہت ٹھیک مگر یہ ناممکن۔ جب انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین ہی یہ بنا لیا کہ کوئی ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے لڑکا ہاسٹل کی زد سے محفوظ رہے، تو کسی ترکیب کا سوجھ جانا کیا مشکل تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور و خوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے اور ان کو ہمارا سرپرست بنا دیا گیا۔ میرے دل میں ان کی عزت پیدا کرنے کے لیے بہت سے شجروں کی ورق گردانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا گیا کہ وہ واقعی میرے ماموں ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میں ایک شیر خوار بچہ تھا تو وہ مجھ سے بے انتہا محبت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم پڑھیں کالج میں اور رہیں ماموں کے گھر۔

اس سے تحصیل علم کا جو ایک ولولہ سا ہمارے دل میں اٹھ رہا تھا اور کچھ بیٹھ سا گیا۔ ہم نے سوچا یہ ماموں لوگ اپنی سرپرستی کے زعم میں والدین سے بھی زیادہ احتیاط برتیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے دماغی اور روحانی قویٰ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے گا۔ اور تعلیم کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں خوف تھا۔ ہم روز بروز مرجھاتے چلے گئے۔ اور ہمارے دماغ پر پھپھوندی سی جمنے لگی۔ سینما جانے کی اجازت کبھی کبھار مل جاتی تھی۔ لیکن اس شرط پر کہ بچوں کو بھی ساتھ لیتا جاؤں۔ اس صحبت میں میں بھلا سینما سے کیا اخذ کر سکتا تھا۔ تھیٹر کے معاملے میں ہماری معلومات اندر سبھا سے آگے بڑھنے نہ پائیں۔ تیرنا ہمیں نہ آیا۔ کیونکہ ہمارے ماموں کا ایک مشہور قول ہے کہ ڈوبتا وہی ہے جو تیراک ہو جسے تیرنا نہ آتا ہو وہ پانی میں گھستا ہی نہیں۔ گھر پر آنے جانے والے دوستوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے اور بال کتنے لمبے رکھے جائیں۔ ان کے متعلق ہدایات بہت کڑی تھیں۔ ہفتے میں دو بار گھر خط لکھنا ضروری تھا۔ سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے گانے بجانے کی سخت ممانعت تھی۔

یہ سپاہیانہ زندگی ہمیں راس نہ آئی۔ یوں تو دوستوں سے ملاقات بھی ہو جاتی تھی، سیر کو بھی چلے جاتے تھے، ہنس بول بھی لیتے تھے لیکن وہ جو زندگی میں ایک آزادی ایک فراخی ایک وارفتگی ہونی چاہیے وہ ہمیں نصیب نہ ہوئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے ماحول پر غور کرنا شروع کیا کہ ماموں جان عموماً کس وقت گھر میں ہوتے ہیں۔ کس وقت باہر جاتے ہیں۔ کس کمرے سے کس کمرے تک گانے کی آواز نہیں پہنچ سکتی کس دروازے سے کمرے کے کس کونے میں جھانکنا ممکن ہے۔ گھر کا کون سا دروازہ رات کے وقت باہر سے کھولا جا سکتا ہے کونسا ملازم موافق ہے کونسا نمک حلال ہے۔ جب تجربے اور مطالعے سے ان باتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تو ہم نے اس زندگی میں بھی نشو ونما کے لیے چند گنجائشیں پیدا کر لیں۔ لیکن پھر بھی ہم روز دیکھتے تھے کہ ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندگی کی شاہراہ پر چل رہے ہیں۔ ہم ان کی زندگی پر رشک کرنے لگے۔ اپنی زندگی کو سدھارنے کی خواہش ہمارے دل میں روز بروز بڑھتی گئی۔ ہم نے دل سے کہا والدین کی نافرمانی کسی مذہب میں جائز نہیں لیکن ان کی خدمت میں درخواست کرنا ان کے سامنے اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا، ان کو صحیح واقعات سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے فرض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی۔

چنانچہ جب گرمیوں کی تعطیلات میں مَیں وطن کو واپس گیا تو چند مختصر مگر جامع اور مؤثر تقریریں اپنے دماغ میں تیار رکھیں۔ گھر والوں کو ہاسٹل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہاں کی آزادی نوجوانوں کے لیے از حد مضر ہوتی ہے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہزارہا واقعات ایسے تصنیف کیے جن سے ہاسٹل کے قواعد کی سختی ان پر اچھی طرح روشن ہو جائے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے ظلم وتشدد کی چند مثالیں رقت انگیز اور ہیبت خیز پیرائے میں سنائیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری اور بیچارے اشفاق کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت بچارا ہاسٹل کو واپس آ رہا تھا۔ چلتے چلتے پاؤں میں موچ آ گئی دو منٹ دیر سے پہنچا۔ صرف دو منٹ۔ بس صاحب اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے فوراً تار دے کر اس کے والد کو بلوایا۔ پولیس نے تحقیقات کرنے کو کہا۔ اور مہینے بھر کے لیے اس کا جیب خرچ بند کروا دیا۔

توبہ ہے الٰہی!

لیکن یہ واقعہ سن کر گھر کے لوگ سپرنٹنڈنٹ صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ہاسٹل کی خوبی ان پر واضح نہ ہوئی۔ پھر ایک دن موقع پا کر بچارے محمود کا واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ شامت اعمال بچارا سینما دیکھنے چلا گیا۔ قصور اس سے یہ ہوا کہ ایک روپے والے درجے میں جانے کی بجائے وہ دو روپے والے درجے میں چلا گیا۔ بس اتنی سی فضول خرچی پر اسے عمر بھر کو سینما جانے کی ممانعت ہو گئی ہے۔

لیکن اس سے بھی گھر والے متاثر نہ ہوئے۔ ان کے رویے سے مجھے فوراً احساس ہوا کہ ایک روپے اور دو روپے کی بجائے آٹھ آنے اور ایک روپیہ کہنا چاہیے تھا۔

انہی ناکام کوششوں میں تعطیلات گزر گئیں اور ہم نے پھر ماموں کی چوکھٹ پر آ کر سجدہ کیا۔

اگلی گرمیوں میں جب ہم پھر گھر گئے تو ہم نے ایک نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ دو سال تعلیم پانے کے بعد ہمارے خیالات میں پختگی سی آ گئی تھی پچھلے سال ہاسٹل کی حمایت میں جو دلائل ہم نے پیش کی تھیں، وہ اب ہمیں نہایت بودی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب کے ہم نے اس موضوع پر ایک لیکچر دیا کہ جو شخص ہاسٹل کی زندگی سے محروم ہو اس کی شخصیت نامکمل رہ جاتی ہے۔ ہاسٹل سے باہر شخصیت پنپنے نہیں پاتی۔ چند دن تو ہم اس پر فلسفیانہ گفتگو کرتے رہے اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس پر بہت کچھ روشنی ڈالی' لیکن ہمیں محسوس ہوا کہ بغیر مثالوں کے کام نہ چلے گا اور جب مثالیں دینے کی نوبت آئی، تو ذرا دقت محسوس ہوئی۔ کالج کے جن طلباء کے متعلق میرا ایمان تھا کہ وہ زبردست شخصیتوں کے مالک ہیں ان کی زندگی کچھ ایسی نہ تھی، کہ والدین کے سامنے بطور نمونے کے پیش کی جا سکے۔ ہر وہ شخص جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے جانتا ہے کہ ''والدینی اغراض'' کے لیے واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے پیرائے میں بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن اس پیرائے کا سوجھ جانا الہام اور اتفاق پر منحصر ہے۔ بعض روشن خیال بیٹے اپنے والدین کو اپنے حیرت انگیز اوصاف کا قائل نہیں کر سکتے اور بعض نالائق سے نالائق طالب علم والدین کو کچھ اس طرح مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہر ہفتے ان کے نام منی آرڈر چلا آتا ہے۔

بناداں آں چناں روزی رساند
که دانا اندراں حیراں بماند

جب ہم ڈیڑھ مہینے تک شخصیت اور ہاسٹل کی زندگی پر اس کا انحصار، ان دو مضمونوں پر وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے، تو ایک دن والد نے پوچھا:

''تمہارا شخصیت سے آخر مطلب کیا ہے؟''

میں تو خدا سے یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے عرض و معروض کا موقع دیں۔ میں نے کہا ''دیکھئے نا۔ مثلاً ایک طالب علم ہے، وہ کالج میں پڑھتا ہے اب ایک تو اس کا دماغ ہے دوسرا اس کا جسم ہے۔ جسم کی صحت بھی ضروری ہے اور دماغ کی صحت تو ضروری ہے ہی۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور بات بھی ہوتی ہے۔ جس سے آدمی گویا پہچانا جاتا ہے میں اس کو شخصیت کہتا ہوں۔ اس کا تعلق نہ جسم

سے ہوتا ہے نہ دماغ سے ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کی جسمانی صحت بالکل خراب ہو اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس کی شخصیت نہ خیر دماغ تو بے کار نہیں ہونا چاہیے ورنہ انسان خبطی ہوتا ہے لیکن پھر بھی اگر ہو بھی، تو بھی گویا شخصیت ایک ایسی چیز ہے، ٹھہریئے، میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

ایک منٹ کے بجائے والد نے مجھے آدھ گھنٹے کی مہلت دی جس کے دوران وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا انتظار کرتے رہے، اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

تین چار دن کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے شخصیت نہیں سیرت کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ ہے۔ سیرت کے لفظ سے نیکی ٹپکتی ہے۔ چنانچہ میں نے سیرت کو اپنا تکیہ کلام بنالیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے۔

''کیا سیرت سے تمہارا مطلب چال چلن ہے یا کچھ اور؟'' میں نے کہا ''چال چلن ہی کو لیجئے۔''

''تو گویا دماغی اور جسمانی صحت کے علاوہ چال چلن بھی اچھا ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا ''بس یہی تو میرا مطلب ہے۔''

''اور یہ چال چلن ہاسٹل میں رہنے سے بہت اچھا ہو جاتا ہے۔''

میں نے نسبتاً نحیف آواز سے کہا ''جی ہاں۔''

''یعنی ہاسٹل میں رہنے والے طالب علم نماز، روزے کے زیادہ پابند ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، سچ زیادہ بولتے ہیں، نیک زیادہ ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''جی ہاں۔''

کہنے لگے ''وہ کیوں؟''

اس سوال کا جواب ایک دفعہ پرنسپل صاحب نے تقسیمِ انعامات کے جلسے میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا، اے کاش میں نے اس وقت توجہ سے سنا ہوتا!

اس کے بعد پھر سال بھر میں ماموں کے گھر میں ''زندگی ہے تو خزاں کے بھی گزر جائیں گے دن۔'' گاتا رہا۔

ہر سال میری درخواست کا یہی حشر ہوتا رہا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے سال گرمی کی چھٹیوں میں پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتا۔ ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا نئی مثالیں کام میں لاتا۔ جب شخصیت اور سیرت والے مضمون سے کام نہ چلا تو اگلے سال ہاسٹل کی زندگی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا اس سے اگلے سال یہ دلیل پیش کی، کہ ہاسٹل میں رہنے سے پروفیسروں کے ساتھ ملنے جلنے کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان ''بیرون از کالج'' ملاقاتوں سے انسان پارس ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے سال یہ مطلب یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی اچھی ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ مکھیاں اور مچھر مارنے کے لیے کئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال یوں سخن پیرا ہوا کہ جب بڑے بڑے حکام کالج کا معائنہ کرنے آتے ہیں تو ہاسٹل میں رہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے

ہیں، اس سے رسوخ بڑھتا ہے لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، میری تقریروں میں جوش بڑھتا گیا معقولیت کم ہوتی گئی۔ شروع شروع میں ہاسٹل کے مسئلے پر والد مجھ سے باقاعدہ بحث کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے یک لفظی انکار کا رویہ اختیار کیا۔ پھر ایک آدھ سال مجھے ہنس کے ٹالتے رہے۔ اور آخر میں یہ نوبت آن پہنچی کہ وہ ہاسٹل کا نام سنتے ہی طنز آمیز قہقہے کے ساتھ مجھے تشریف لے جانے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔

ان کے اس سلوک سے آپ یہ اندازہ نہ لگائیے کہ ان کی شفقت کچھ کم ہوگئی تھی، ہرگز نہیں حقیقت صرف اتنی ہے کہ بعض ناگوار حادثات کی وجہ سے گھر میں میرا اقتدار کچھ کم ہوگیا تھا۔

اتفاق یہ ہوا کہ میں نے جب پہلی مرتبہ بی-اے کا امتحان دیا، تو فیل ہوگیا۔ اگلے سال ایک مرتبہ پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد بھی جب تین چار دفعہ یہی قصہ ہوا تو گھر والوں نے میری امنگوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ بی-اے میں پے در پے فیل ہونے کی وجہ سے میری گفتگو میں ایک سوز تو ضرور آگیا تھا، لیکن کلام میں وہ پہلے جیسی شوکت اور میری رائے کی وہ پہلی جیسی وقعت اب نہ رہی تھی۔

میں زمانہ طالب علمی کے اس دور کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس سے ایک تو آپ میری زندگی کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہو جائیں گے اور اس کے علاوہ اس سے یونیورسٹی کی بعض بے قاعدگیوں کا راز بھی آپ پر آشکار ہو جائے گا۔

میں پہلے سال بی-اے میں کیوں فیل ہوا؟ اس کا سمجھنا بہت آسان ہے۔ بات یہ ہوئی کہ جب ہم نے ایف-اے کا امتحان دیا تو چونکہ ہم نے کام خوب دل لگا کر کیا تھا، اس لیے ہم اس میں ''کچھ'' پاس ہی ہوگئے۔ بہرحال فیل نہ ہوئے، یونیورسٹی نے یوں تو ہمارا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کیا لیکن ریاضی کے متعلق یہ ارشاد ہوا، کہ صرف اس مضمون کا امتحان ایک آدھ دفعہ پھر دے ڈالو۔ (ایسے امتحان کو اصلاحاً کمپارٹمنٹ کا امتحان کہا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے اگر کوئی اس میں سفر کر رہے ہوں، نقل نویسی کی سخت ممانعت ہے۔)

اب جب ہم بی-اے میں داخل ہونے لگے، تو ہم نے یہ سوچا کہ بی-اے میں ریاضی لیں گے۔ اس طرح کمپارٹمنٹ کے امتحان کے لیے فالتو کام نہ کرنا پڑے گا۔ لیکن ہمیں سب لوگوں نے یہی مشورہ دیا کہ تم ریاضی مت لو۔ جب ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کسی نے ہمیں معقول جواب نہ دیا لیکن جب پرنسپل صاحب نے بھی مشورہ دیا تو ہم رضامند ہوگئے۔ چنانچہ بی-اے میں ہمارے مضامین انگریزی، تاریخ اور فارسی قرار پائے۔ ساتھ ساتھ ہم ریاضی کے امتحان کی بھی تیاری کرتے رہے۔ گویا ہم تین کے بجائے چار مضمون پڑھ رہے تھے۔ اس طرح سے جو صورتحال پیدا ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں یونیورسٹی کے امتحانات کا کافی تجربہ ہے۔ ہماری قوت مطالعہ منتشر ہوگئی اور خیالات میں پراگندگی پیدا ہوئی۔ اگر مجھے چار کے بجائے صرف تین مضامین پڑھنے ہوتے تو جو وقت میں فی الحال چوتھے مضمون کو دے رہا تھا وہ بانٹ کر ان تین مضامین کو دیتا۔ آپ یقین مانیئے اس سے بڑا فرق پڑ جاتا اور فرض کیا، اگر میں وہ وقت تینوں کو بانٹ کر نہ دیتا، بلکہ سب کا سب ان تینوں میں سے کسی ایک مضمون کے

اب ہوا اور اس کا دماغ بھی بالکل بیکار ہو، لیکن پھر بھی اس
لیکن پھر بھی اگر ہو بھی، تو بھی گویا شخصیت ایک ایسی چیز

جس کے دوران وہ خاموشی کے ساتھ میرے جواب کا

میں سیرت کہنا چاہیے۔ شخصیت ایک بے رنگ سا لفظ
بنالیا۔ لیکن یہ بھی مفید ثابت نہ ہوا۔ والد کہنے لگے۔
بلن ہی کو لیجیے۔''
ہیے۔''

ہوتے ہیں، ملک کی زیادہ خدمت کرتے ہیں، یچ

یں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا،

گزر جائیں گے دن۔'' گاتا رہا۔
ہر سال ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ لیکن اگلے
ہر دفعہ نئی نئی دلیلیں پیش کرتا نئی مثالیں کام
گی کے انضباط اور باقاعدگی پر تبصرہ کیا اس
کے موقعے زیادہ ملتے رہتے ہیں۔ اور ان
یوں ادا کیا کہ ہاسٹل کی آب و ہوا بڑی
ئی کئی افسر مقرر ہیں۔ اس سے اگلے سال
ہنے والے طلبا سے فرداً فرداً ہاتھ ملاتے

لیے وقف کر دیتا تو کم از کم اس مضمون میں تو ضرور پاس ہو جاتا۔ لیکن موجودہ حالات میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں کسی مضمون پر بھی کماحقہ توجہ نہ کر سکا۔ کمپارٹمنٹ کے امتحان میں تو پاس ہو گیا، لیکن بی۔اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو ہونا ہی تھا، کیونکہ انگریزی ہماری مادری زبان نہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ اور فارسی میں بھی فیل ہو گیا اب آپ ہی سوچئے نا کہ جو وقت مجھے کمپارٹمنٹ کے امتحان پر صرف کرنا پڑا وہ اگر میں وہاں صرف نہ کرتا، بلکہ اس کے بجائے.....مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔

فارسی میں کسی ایسے شخص کا فیل ہونا جو ایک علم دوست خاندان سے تعلق رکھتا ہو لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب ہوا۔ اور سچ پوچھیے تو ہمیں بھی اس پر سخت ندامت ہوئی۔ لیکن خیر اگلے سال یہ ندامت دھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال تاریخ میں پاس ہو گئے اور اس سے اگلے سال انگریزی میں۔

اب قاعدے کی رو سے ہمیں بی۔اے کا سرٹیفکیٹ مل جانا چاہیے تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا ضروری ہے۔ بعض طبائع ایسی ہیں کہ جب تک یکسوئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغ کو زبردستی ایک کھچڑی سا بنا دیا جائے۔ ہم نے ہر سال صرف ایک مضمون پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی حاصل کی کہ باید و شاید، باقی دو مضمون ہم نے نہیں دیکھے لیکن ہم نے یہ تو ثابت کر دیا، کہ جس مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔

اب تک تو دو دو مضمونوں میں فیل ہوتے رہے تھے لیکن اس کے بعد ہم نے تہیہ کر لیا، کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو وسیع کریں گے۔ یونیورسٹی کے بیہودہ اور بے معنی قواعد کو ہم اپنی مرضی کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔ لیکن جتنا غور کیا اس نتیجے پر پہنچے کہ تین مضمونوں میں بیک وقت پاس ہونا فی الحال مشکل ہے۔ پہلے دور میں پاس ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم پہلے سال انگریزی اور فارسی میں پاس ہو گئے اور دوسرے سال فارسی اور تاریخ میں۔

جن جن مضامین میں ہم جیسے جیسے فیل ہوئے وہ اس نقشے سے ظاہر ہیں۔

(1) انگریزی..........تاریخ............فارسی

(2) انگریزی........تاریخ

(3) انگریزی........فارسی

(4) تاریخ.........فارسی

گویا جن جن طریقوں سے ہم دو دو مضامین میں فیل ہو سکتے تھے وہ ہم نے سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے لیے دو مضامین میں فیل ہونا ناممکن ہو گیا۔ اور ایک ایک مضمون میں فیل ہونے کی باری آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے کے مطابق فیل ہونا شروع کر دیا۔

(5) تاریخ میں فیل

(6) انگریزی میں فیل

اتنی دفعہ امتحان دے چکنے کے بعد جب ہم نے اپنے نتیجوں کو یوں اپنے سامنے رکھ کر غور کیا، تو ثابت ہوا کہ غم کی رات ختم ہونے والی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ اب ہمارے فیل ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فارسی میں فیل ہو جائیں۔ لیکن اس کے بعد تو پاس ہونا لازم ہے ہر چند کہ یہ سانحہ از حد جانکاہ ہوگا۔ لیکن اس میں یہ مصلحت تو ضرور مضمر ہے کہ اس سے ہمیں ایک قسم کا ٹیکا لگ جائے گا۔ بس یہی ایک کسر باقی رہ گئی ہے۔ اس سال فارسی میں فیل ہوں گے اور پھر اگلے سال قطعی پاس ہو جائیں گے۔ چنانچہ ساتویں دفعہ امتحان دینے کے بعد ہم بے تابی سے فیل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار دراصل فیل ہونے کا انتظار نہ تھا بلکہ اس بات کا انتظار تھا کہ اس فیل ہونے کے بعد ہم اگلے سال ہمیشہ کے لیے بی۔اے ہو جائیں گے۔

ہر سال امتحان کے بعد جب گھر آتا، تو والدین کو نتیجے کے لیے پہلے ہی تیار کر دیتا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یکلخت اور فوراً، رفتہ رفتہ تیار کرنے سے خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اور پریشانی مفت میں طویل کھینچتی ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ تھا کہ جاتے ہی کہہ دیا کرتے تھے، کہ اس سال تو کم از کم پاس نہیں ہو سکتے والدین کو اکثر یقین نہ آتا۔ ایسے موقعوں پر طبیعت کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے میں پرچوں میں کیا لکھ کر آیا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ممتحن لوگ اگر نشے کی حالت میں پرچے نہ دیکھیں تو میرا پاس ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے تمام بہی خواہوں کو بھی اس بات کا یقین ہو جائے، تا کہ وقت پر ان کو صدمہ نہ ہو۔ لیکن یہ بہی خواہ ہیں، کہ میری تمام تشریحات کو محض کسر نفسی سمجھتے ہیں۔ آخری سالوں میں والد کو فوراً یقین آ جایا کرتا تھا کیونکہ تجربے سے ان پر ثابت ہو چکا تھا، کہ میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا، لیکن ادھر ادھر کے لوگ ''اجی نہیں صاحب'' اجی کیا کہہ رہے ہو'' ''اجی یہ بھی کوئی بات ہے'' ایسے فقروں سے ناک میں دم کر دیتے۔ بہرحال اب کے پھر گھر پہنچتے ہی ہم نے حسب دستور اپنے فیل ہونے کی پیشین گوئی کر دی۔ دل کو یہ تسلی تھی، کہ بس یہ آخری دفعہ ہے۔ اگلے سال ایسی پیش گوئی کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

ساتھ ہی خیال آیا، کہ وہ ہاسٹل کا قصہ پھر شروع کرنا چاہیے۔ اب تو کالج میں صرف ایک ہی سال باقی رہ گیا ہے۔ اب بھی ہاسٹل میں رہنا نصیب نہ ہوا تو عمر بھر گویا آزادی سے محروم رہے۔ گھر سے نکلے، تو ماموں کے ڈربے میں اور جب ماموں کے ڈربے سے نکلے تو شاید اپنا ایک ڈربہ بنانا پڑے گا۔ آزادی کا ایک سال صرف ایک اور یہ آخری موقع ہے۔

آخری درخواست کرنے سے پہلے میں نے تمام ضروری مصالحہ بڑی احتیاط سے جمع کیا جن پروفیسروں سے مجھے اب ہم عمری کا فخر حاصل تھا، ان کے سامنے نہایت بے تکلفی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کیا اور ان سے والد کو خطوط لکھوائے کہ اگلے سال لڑکے کو ضرور آپ ہاسٹل میں بھیج دیں۔ بعض کامیاب طلبا کے والدین سے بھی اس مضمون کی عرض داشتیں بھجوائیں۔ خود اعداد و شمار سے ثابت کیا، کہ یونیورسٹی سے جتنے لڑکے پاس ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ہاسٹل میں رہتے ہیں، اور یونیورسٹی کا کوئی وظیفہ یا تمغہ یا انعام تو کبھی ہاسٹل سے باہر گیا ہی نہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ دلیل مجھے اس سے پیشتر کبھی کیوں نہ سوجھی تھی۔ کیونکہ یہ بہت کارگر ثابت ہوئی۔ والد کا انکار نرم ہوتے ہوتے غور و خوض میں تبدیل ہو گیا، لیکن پھر بھی ان کے دل سے شک رفع نہ ہوا۔ کہنے لگے ''میری سمجھ میں نہیں آتا، کہ جس لڑکے کو پڑھنے کا شوق ہو وہ ہاسٹل کے بجائے گھر پر کیوں نہیں پڑھ سکتا۔''

میں تو وہی ہونا لازم تھا جو ہوا۔ یعنی یہ کہ میں
۔اے میں ایک تو انگریزی میں فیل ہوا۔ وہ تو
بھی فیل ہو گیا اب آپ ہی سوچیے نا کہ جو
کے بجائے..... مگر خیر یہ بات میں پہلے عرض

تھا ہو لوگوں کے لیے از حد حیرت کا موجب
ڈھل گئی۔ اور ہم فارسی میں پاس ہو گئے اور

یونیورسٹی کی اس طفلانہ ضد کا کیا علاج کہ تینوں
ئی نہ ہو، مطالعہ نہیں کر سکتیں۔ کیا ضروری ہے
ن پر اپنی تمام تر توجہ دی اور اس میں وہ کامیابی
س مضمون میں چاہیں پاس ہو سکتے ہیں۔
تہیہ کر لیا، کہ جہاں تک ہو سکا اپنے مطالعہ کو
بنا سکتے تو اپنی طبیعت پر ہی کچھ زور ڈالیں۔
ں ہے۔ پہلے دور میں پاس ہونے کی کوشش
فارسی اور تاریخ میں۔

سب پورے کر دیئے۔ اس کے بعد ہمارے
آئی۔ چنانچہ اب ہم نے مندرجہ ذیل نقشے

میں نے جواب دیا کہ ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے، جو ارسطو اور افلاطون کے گھر کے سوا اور کسی گھر میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔ ہاسٹل میں جسے دیکھو بحرِ علوم میں غوطہ زن نظر آتا ہے باوجود اس کے کہ ہر ہاسٹل میں دو دو تین تین سولڑکے رہتے ہیں پھر بھی وہ خاموشی طاری ہوتی ہے کہ قبرستان معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ ہر ایک اپنے اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ شام کے وقت ہاسٹل کے صحن میں جا بجا طلبا علمی مباحثوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ علی الصباح ہر ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے ہاسٹل کے چمن میں ٹہلتا نظر آتا ہے۔ کھانے کے کمرے میں، کامن روم میں، غسل خانوں میں، برآمدوں میں، ہر جگہ لوگ فلسفے اور ریاضی اور تاریخ کی باتیں کرتے ہیں، جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبا رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ......''

والد نے اجازت دے دی۔

اب ہمیں یہ انتظار کہ کب فیل ہوں، اور کب اگلے سال کے لیے عرضی بھیجیں۔ اس دوران میں ہم نے ان تمام دوستوں سے خط و کتابت کی جن کے متعلق یقین تھا کہ اگلے سال پھر ان کی رفاقت نصیب ہوگی، اور انہیں یہ مژدہ سنایا کہ آئندہ سال ہمیشہ کے لیے کالج کی تاریخ میں یادگار رہے گا کیونکہ ہم تعلیمی زندگی کا ایک وسیع تجربہ اپنے ساتھ لیے ہاسٹل میں آرہے ہیں جس سے ہم طلبا کی نئی پود کو مفت مستفید فرمائیں گے۔ اپنے ذہن میں ہم نے ہاسٹل میں اپنی حیثیت ایک مادر مہربان کی سی سوچ لی جس کے اردگرد نا تجربہ کار طلبا مرغی کے بچوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کو جو کسی زمانے میں ہمارے ہم جماعت رہ چکے تھے لکھ بھیجا کہ جب ہم ہاسٹل میں آئیں تو فلاں فلاں مراعات کی توقع آپ سے رکھیں گے اور فلاں فلاں قواعد سے اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھیں گے۔ اطلاعاً عرض ہے اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ہماری بدنصیبی دیکھئے کہ جب نتیجہ نکلا تو ہم پاس ہو گئے۔

ہم پہ تو جو ظلم ہوا سو ہوا، یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

''ہاسٹل میں پڑنا''.....تجزیاتی نوٹ

احمد شاہ بخاری پطرس اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ بخاری ایک بلند پایہ انشا پرداز، مانے ہوئے نقاد اور ایک کامیاب مترجم تھے۔ مزاحیہ مضامین لکھنے کی بدولت ان کا شمار اردو کے ممتاز مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ پطرس کا مطالعہ بہت گہرا تھا اور دورانِ تعلیم ہی پطرس اپنے اساتذہ کی داد وتحسین سمیٹنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

پطرس نے خالص مزاح تخلیق کیا اور وہ مزاح کو تمسخر اور طنز سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ ان کے مضامین کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ہنسنا ہنسانا یا تفریح باہم پہنچانا نہیں ہے بلکہ معاشرے کے لیے ایک ہمدردانہ رویہ ہے۔ پطرس زندگی کے مضحک پہلوؤں کے چہرے سے نقاب ہٹاتے ہیں۔ ان کے مزاح میں صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ان کے ہاں لطیف طنز پایا جاتا ہے۔ پطرس معمولی سے معمولی بات میں بھی مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

ہمارے نصاب میں شامل ان کا مضمون ''ہاسٹل میں پڑنا'' اقامتی درسگاہ کی خصوصیات پر مبنی ہے۔ مضمون میں پطرس ایک متمول خاندان کے فرزند کا احوال بیان کرتے ہیں جو بمشکل ایف اے پاس کر کے کالج پہنچتا ہے اور اپنی مزید تعلیم کے لیے لاہور کا رخ کرتا ہے۔ مضمون کی ہر سطر مصنف کی قادرالکلامی اور مشاہدے کی زندہ مثال ہے۔ سفید پوش روائتی گھرانوں کے گھر کا ماحول کیسا ہوتا ہے؟ ان کے بچے کس طرح کے ہوتے ہیں؟ ان کے نفسیاتی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ والدین اپنے بچوں کے لیے کس طرح سوچتے ہیں؟ ان کی کیا امیدیں ہوتی ہیں؟ اولاد اگر جوان ہو جائے تو ان کے خیالات میں کیسے تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ یہ دیہی بُرژوا خاندان شہری زندگی کو کیا تصور کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کو اتنے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے چلتی پھرتی تصاویر نظر آتی ہیں اور پطرس کے مشاہدے کی داد دینی پڑتی ہے۔ ہر جملہ ایک پختہ مزاح کا عکاس پطرس کی برجستگی دیکھیے:

''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چنانچہ از حد غور وخوض کے بعد لاہور میں ہمارے ایک ماموں دریافت کیے گئے۔''

اب آگے چل کر ماموں کے گھر کا ماحول اور دستور کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

''گھر پر آنے جانے والوں کا انتخاب ماموں کے ہاتھ میں تھا۔ کوٹ کتنا لمبا پہنا جائے، بال کتنے لمبے رکھے جائیں، ہفتے میں دو بار خط لکھنا ضروری تھا مگر سگریٹ غسل خانے میں چھپ کر پیتے تھے۔''

پطرس نے اس نوجوان کی زبانی ہاسٹل کے متعلق لوگوں کے خیالات، شہری زندگی کے حوالے سے وسوسے ان سب باریکیوں کو اتنے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ پطرس دراصل سینما، سگریٹ، ہاسٹل کے بارے میں والدین کے جذبات کو نہیں پیش کر رہے بلکہ وہ اس بات سے پردہ ہٹا رہے ہیں کہ والدین کو اولاد کی پرورش کرتے وقت ان کی عمر، ضروریات، ان کی سوچ اور ان کی نفسیات پر غور کرنا چاہیے اور نوجوان اولاد پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسی چاہیے ورنہ یہی نتیجہ نکلے گا جو مضمون کے مرکزی کردار کا نکلا ہے۔

اس کے علاوہ پطرس یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ہر جگہ اور ہر چیز کے منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں۔ صرف سنی سنائی بات پر کسی چیز کے حوالے سے رائے قائم کر لینا مناسب نہیں ہے۔ مضمون میں پطرس نے ہمارے تعلیمی نظام، امتحانات اور تعلیمی نصاب پر بھی گہری چوٹ کی ہے اور والدین کے کردار کو بھی نمایاں کیا ہے کہ اولاد کی تعلیم وتربیت میں والدین کو کیا کرنا چاہیے۔

پطرس نے مضمون کے مرکزی کردار کا مختلف مضامین میں فیل ہونے کا تذکرہ انتہائی دلچسپ انداز سے کیا ہے مگر وہ بھی نظامِ تعلیم پر ایک گہرا طنز ہے۔ جیسے بار بار فیل ہونے والے طلبا کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

''پروفیسر سے اب مجھے ہم عمری کا فخر حاصل تھا۔''

اس کے علاوہ مرکزی کردار کا اپنے ماموں کے گھر میں رہنا، چھپ چھپ کر شہری زندگی کا حصہ بننا اور ہر سال ایک نئے پیرائے میں اپنے والد کو ہاسٹل میں داخلہ دلوانے کے لیے تیار کرنا جہاں مزاح اور دلچسپی سے بھرپور ہے وہاں حقائق کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ مضمون کا اختتام بھی بڑے مزاحیہ اور طنزیہ انداز سے کیا گیا ہے۔

''یونیورسٹی والوں کی حماقت ملاحظہ فرمائیے کہ ہمیں پاس کر کے اپنی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔''

فخر ومباہات: فخر کرنا، بڑائی
پاسِ وضع: حیثیت کا احساس
حفظ مراتب: مرتبے کا خیال
ممتحن: امتحان لینے والے
نجابت: خاندانی عزت، مرتبہ
بیداریٔ مغز: دانائی، عقل مندی
تالیف: لکھے ہوئے مواد کو ترتیب دی
چنداں: ہرگز، بالکل
رومان انگیز: خواہشات بیدار کرنے
وضع کرنا: بنانا، سنوارنا، مکمل کرنا
معصیت: برائی، گناہ
چرب زبان: زیادہ بولنے والا، بات
مضر: نقصان دہ، خطرناک
ورق گردانی: صفحے پلٹنا
پھپھوندی: سفیدی کی تہہ، گل سڑ ج
بیرون: باہر
سخن پیرا: بولنا، گفتگو کرنا

”ہاسٹل میں پڑنا“.....فرہنگ

فخر و مباہات: فخر کرنا، بڑائی
پاسِ وضع: حیثیت کا احساس
حفظِ مراتب: مرتبے کا خیال
ممتحن: امتحان لینے والے
نجابت: خاندانی عزت، مرتبہ
بیداریٔ مغز: دانائی، عقل مندی
تالیف: لکھے ہوئے مواد کو ترتی دینا
چنداں: ہرگز، بالکل
رومان انگیز: خواہشات بیدار کرنے والا
وضع کرنا: بنانا، سنوارنا، مکمل کرنا
معصیت: برائی، گناہ
چرب زبان: زیادہ بولنے والا، باتونی
مضر: نقصان دہ، خطرناک
ورق گردانی: صفحے پلٹنا
پھپھوندی: سفیدی کی تہہ، گل سڑ جانا
بیرون: باہر
سخن پیرا: بولنا، گفتگو کرنا

مضحت: وقار، اہمیت
پراگندگی: پریشانی، فکر
ندامت: شرمندگی، رسوائی
حسبِ دستور: قانون کے مطابق
ارسطو: یونانی فلسفی، سکندرِ اعظم کا استاد
ناک میں دم کرنا: تنگ کرنا
بحرِ علوم: علم کا سمندر
غوطہ زن: غوطہ لگانا، ’ڈبکی لگانا‘ ڈوب کر پڑھنا
شیکسپیئر: انگریزی زبان کا عظیم ڈرامہ نگار
رفاقت: دوستی، ساتھ
وارفتگی: جھکاؤ، عشق، بے خودی
رقت انگیز: رلانے والا
ہیبت خیز: خوفناک
شامتِ اعمال: کیے کا پھل، گناہوں کا انجام
چوکھٹ: دروازہ

شدومد: شدت سے، زور سے
مراعات: سہولیات
حماقت: بے وقوفی، احمق پن
ممانعت: روکنا، باز رہنا
خبطی: کم عقل
کندذہن: پاگل
الضابط: اصول پسندی، ضابطہ
بہتات: کثرت
بہی خواہ: خیریت چاہنے والا
پے در پے: مسلسل، بار بار
سہل: آسان
کماحقہ: مکمل طور پر، احسن طریقے سے
گردونواح: آس پاس، اردگرد
نحیف: کمزور، لاغر
نشوونما: بڑھنا
نگہداشت: دیکھ بھال، نگرانی

میر تقی میر

پیدائش:23-1722ء آگرہ۔ وفات:20دسمبر1810ء لکھنؤ

میر نے ابتدائی تعلیم والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی۔ بچپن میں استاد اور والد کی وفات اور بعد ازاں سوتیلے بھائی کی بدسلوکی نے میر کو آغاز شباب میں ہی نقل مکانی پر مجبور کیا اور یوں مضطرب طبیعت اور قریبی عزیزوں کی زیادتیوں کے باعث میر کو کہیں بھی ٹھکانہ نہ ملا۔ اس طرح میر کی زندگی میں رنج وغم کے ایسے باب کا آغاز ہوا جس نے تادمِ مرگ ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

میر جس عہد میں زندہ تھے، وہ بدامنی اور انتشار کی انتہا کا زمانہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے حملوں کے باعث دلّی پر کئی مرتبہ قیامت ٹوٹی۔ میر ''ذکرِ میر'' میں لکھتے ہیں کہ دلّی میں تباہی اور بربادی کا یہ عالم تھا کہ لاشے دفن کرنے کے لیے جوان موجود نہ تھے۔ صرف بوڑھے اور عورتیں مرنے والوں کی تدفین کیا کرتی تھیں۔ یوں میر کی ذاتی اور معاشرے کی اجتماعی المناکیوں کا اثر میر کی شاعری پر بہت زیادہ ہوا۔ انہی حالات کے باعث میر دلّی سے لکھنؤ ہجرت کر گئے جہاں ان کی شاعری کو دوام حاصل ہوا۔ میر اردو شاعری کا ایک ایسا روشن مینار ہے جن کی روشنی رہتی دنیا تک شاعری کی دنیا کو منور کرتی رہے گی۔ میر نے اردو شاعری کو جو عروج بخشا اس کا اعتراف ان کے معاصرین اور بعد میں آنے والے ہر بڑے شاعر نے کیا ہے۔

سادگی، سلاست، سوز اور تغزل میر کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ میر نے اپنی شاعری میں غم کو ایک آفاقی حقیقت کے روپ میں پیش کیا۔

تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

میر اپنے کمال سے خود بھی آگاہ ہیں اور انہیں اپنی شاعری اور مقام ومرتبے پر ناز تھا وہ کہتے ہیں:

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میرؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی جن میں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ شامل ہیں مگران کا اصل میدان غزل ہے اور غزل گوئی میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اُس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تغزل کو جس طرح میرؔ نے نبھایا ہے وہ صرف میرؔ ہی کا خاصا ہے۔ تجربے کی گہرائی، مشاہدے کی وسعت، دل آویز لب و لہجہ، سوز و گداز، سادگی، ندرتِ ادا، موسیقیت اور دردمندی جیسی خصوصیات نے میرؔ کی شاعری میں حسن، دلکشی، جاذبیت پیدا کی۔ مگران کی غزل کا سب سے اہم رنگ غم ہے۔

غزل.....1

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رُخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

ثیہ شامل ہیں مگران کا اصل میدان غزل
کہ تغزل کو جس طرح میؔر نے نبھایا ہے وہ
ب ولہجہ' سوز وگداز' سادگی' ندرت ادا'
ت پیدا کی۔مگران کی غزل کا سب سے

اس رنگ سے چمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے بڑا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

تشریحات

شعر....1

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

تاج وری: بادشاہی **نوحہ گری:** ماتم داری

وضاحت

یہ دنیا عارضی ہے۔اس کی بادشاہت بھی عارضی ہے۔دنیا کی بادشاہت پر غرور کرنا عبث ہے۔آج اگر کوئی شخص اپنی بادشاہی یا تخت پر غرور کرتا ہے تو کل اس کے مرنے پر سوائے رونے اور ماتم داری کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

شعر....2

شرمندہ ترے رُخ سے ہے رُخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا

رخسار: گال **کبک دری:** چکور کی خوبصورت چال

وضاحت

میرے محبوب کا چہرہ اتنا خوبصورت ہے کہ پریاں بھی شرما جائیں اور میرے محبوب کی چال (چلنا) اتنی خوبصورت ہے اور دلکش ہے کہ پہاڑی چکور کی چال کی دلکشی بھی اُس کے آگے ماند پڑ جاتی ہے۔

شعر....3

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

آفاق: دنیا **اسباب:** سامان

وضاحت

یہ دنیا ایک مسافر خانے کی مانند ہے اور انسان مسافر کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی چلا جاتا ہے۔اپنا سب کچھ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔اس لیے انسان کو دنیاوی مال و دولت میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنی آخرت کا سامان کرنا چاہیے۔

پر کہ کہے تو
جگری کا

کو بھی جاکر
کی تری کا

ہے بہت کام
گری کا

خبر لے
سحری کا

شعر....4

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

سنگ: پتھر **مداوا:** علاج **آشفتہ سری:** پاگل پن، جنون، شورش، ہنگامہ

وضاحت

عشق میں جو دکھ اور مصیبتیں مجھے اٹھانی پڑی ان کی شدت سے مجھ پر جنون کی کیفیت طاری ہوگئی ہے اور قید خانے میں بھی یہ جنون کم نہ ہو پایا۔ اب میرے عشق، میرے مصائب کا علاج یہی ہے کہ میں اپنے سر میں پتھر مار کر مر جاؤں۔ ان دکھوں سے نجات موت ہی دے سکتی ہے۔

شعر....5

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

داورِ محشر: حشر کے دن کا مالک، مراد اللہ تعالیٰ **بے دادگری:** ناانصافی، ظلم

وضاحت

محبوب کی بے وفائی، ناانصافی اور ظلم کی وجہ سے میرے دل و جگر پر جو زخم آئے ہیں قیامت کے دن میرا ہر زخم خدا سے انصاف مانگے گا اور تجھے (محبوب) کو (خدا کی بارگاہ میں) ان کا حساب دینا ہوگا۔

شعر....6

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

لپکا: شوق **پریشان نظری:** مراد، ہرجائیت، ہرجائی ہونا

وضاحت

عشق کا یہ تقاضا ہے کہ عاشق کی نظر محبوب کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں اٹھتی۔ میرؔ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں آئینے کی طرح ہرجائی نہیں ہوں کہ ہر کوئی اسے دیکھے اور وہ (آئینہ) بھی ہر کسی کو دیکھے میں جس کو چاہتا ہوں بس میری نظر کی وسعت وہیں تک ہے۔ اور وہی (محبوب) میرا سب کچھ ہے۔

شعر....7

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

موسمِ گل: بہار کا موسم — **تہ بال:** پروں میں سر چھپا کر (مراد چھپ کر)

مقدور: ارادہ، توفیق — **بال و پری:** مراد دنیا کا حسن/ رونق

وضاحت

عشق کے دکھوں نے اس قدر مایوس کر دیا ہے کہ بے شمار بہاریں آئیں مگر مجھے ان بہاروں کو دیکھنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی نہ ہی میرا دل چاہا ہے۔ اگر دل مردہ ہو جائے تو دنیا کی خوبصورتی بے معنی ہو جاتی ہے۔ جیسے:

دل تو اپنا اداس ہے ناصؔر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

شعر....8

اس رنگ سے چمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے بڑا اشک عقیقِ جگری کا

اشک: آنسو — **عقیق:** سرخ رنگ کا قیمتی پتھر — **عقیقِ جگری:** خون کے آنسو مراد ہیں

وضاحت

میری پلکوں پر چمکنے والے آنسوؤں کے قطرے اب سرخ رنگ کے ہو گئے ہیں کیونکہ محبوب کی جدائی اب یہ صورت اختیار کر چکی ہے کہ میرؔ پانی کے بجائے خون رو رہا ہے۔ تاریخ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ جب دردِ جگر حد سے بڑھ جائے تو آنکھوں سے خون رواں ہو جاتا ہے۔ (جناب زین العابدّین (امامِ حسینؑ کے بڑے بیٹے) واقعہ کربلا کے بعد خون روتے رہے)۔

شعر....9

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

دستِ نگر: محتاج — **پنجۂ مژگان:** ہاتھ کے پنجے جیسی پلکیں — **تری:** گیلا ہونا

وضاحت

میر کہتے ہیں کہ میں جب سمندر کو دیکھا تو میں اُس کے پانی سے متاثر نہیں ہوا کیونکہ سمندر میں موجود پانی میرے آنسوؤں سے کم تھا اور سمندر میرے آنسوؤں کا محتاج نظر آتا تھا۔ میؔر نے مبالغے میں غلو کی صورت پیش کی ہے۔

شعر....10

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

آفاق: دنیا   **شیشہ گری:** جہاں شیشہ بنتا ہو/ نازک

وضاحت

اس دنیا میں انسان کو بڑی ہوش مندی اور احتیاط سے رہنا چاہیے کیونکہ اس دنیا کی مثال ایک شیشہ بنانے والے کارخانے کی مانند ہے اور تھوڑی سی بے احتیاطی بھی کسی حادثے کا سبب بن سکتی ہے۔ میؔر دل والوں کی دنیا کو شیشے کے کارخانے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔

شعر....11

ٹک میؔر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

جگر سوختہ: زخمی دل/ جلا ہوا جگر (مراد مرنے کے قریب)

چراغِ سحری: صبح کے وقت کا چراغ جو کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے

وضاحت

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر میر کہتا ہے کہ میرے سانسوں کی ڈوری کسی وقت بھی ٹوٹ سکتی ہے یعنی میں مرنے کے قریب ہوں۔ (اے محبوب) تم جتنا جلد ممکن ہو آجاؤ تاکہ میں مرنے سے پہلے تیرا دیدار کرلوں۔ محبوب کا وصل عاشق کی پہلی اور آخری خواہش بھی یہی ہوتی ہے۔

تجزیاتی نوٹ........غزل نمبر 1

مجنوں گورکھ پوری کہتے ہیں کہ ''ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خدا ہوتا ہے اسی طرح غزل کا خدا میر تقی میرؔ ہے'' میرؔ کے بغیر اردو غزل کی تاریخ نامکمل ہے۔

میرؔ کو بچپن سے لے کر جوانی اور پھر بڑھاپے تک جن حالات کا سامنا کرنا پڑا اُس کا اثر ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ میر کے ذاتی حالات بھی دگرگوں تھے اور میرؔ کو جو زمانہ میسر ہوا وہ بھی افراتفری اور بدامنی سے بھرپور تھا۔ اس طرح ان کے ذاتی اور معاشرے کے اجتماعی حالات نے براہِ راست ان کی شاعری کو متاثر کیا اور یوں غم ان کی شاعری میں ایک نمایاں عنصر کے طور پر سامنے آیا مگر یہ غم انسان میں مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں کرتا بلکہ اُمید کی ایک کرن دکھاتا ہے۔

کلاسیکی شاعری میں تصوف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسی طرح اس غزل میں بھی تصوف کے افکار موجود ہیں۔ عجز تصوف کا بنیادی تصور ہے جو اس غزل میں ہمیں نظر آتا ہے۔ غزل کا آغاز ہی عجز سے ہوتا ہے۔ اسی طرح تصوف اور عشق کے کئی مدارج ہیں جیسے پسندیدگی، تمنا اور موافقت، تمام درجات کو عبور کر کے جب انسان اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کو صرف محبوب کی ذات نظر آتی ہے اور محبوب کے علاوہ تمام خیالات اُس کے دل سے نکل جاتے ہیں اُسے ہر شے میں اپنا محبوب نظر آتا ہے۔ اس منزل پر جا کر انسان اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ اس غزل میں ہمیں تصوف، عشق اور نفیِ ذات کے تمام مدارج نظر آتے ہیں۔

تسلیم و رضا کا شیوہ عشق کے بنیادی مدارج میں سے ایک ہے۔ محبوب کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اُس کی خواہشات کو اپنی خواہشات پر ترجیح دینا یہ سب چیزیں عاشق اور عشق کی منزل کو بلند کرتی ہیں۔ متذکرہ غزل میں تسلیم و رضا کا جذبہ بھی موجود ہے جو کہ ایک عاشق کی پہچان ہے۔

حسن اور عشق لازوال ہے جب کہ زندگی عارضی اور ختم ہو جانے والی ہے۔ عشق کا خاتمہ زندگی کے خاتمے کے ساتھ مشروط ہے۔ ورنہ عشق زندہ رہتا ہے۔

اس غزل میں عشق کی پائیداری اور زندگی کی ناپائیداری کا احوال بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

عشق جب حد سے گزر جائے تو جنون کی کیفیت اختیار کر جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب عاشق دنیا کو آسودہ دیکھتا ہے تو اپنے اندر کی ناآسودگی اسے جنوں کی طرف لے جاتی ہے اور اس دیوانگی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس دیوانگی کو

دنیا کی مثال ایک شیشہ بنانے والے
دل والوں کی دنیا کو شیشے کے کارخانے

لے
کا

بھی ٹوٹ سکتی ہے یعنی میں مرنے کے
لوں۔ محبوب کا وصل عاشق کی پہلی اور

پتھروں کا تحفہ بھی ملتا ہے جس کا ذکر میر نے اس غزل میں کیا ہے۔

صبر و تحمل اور مستقل مزاجی عشق کے زیور ہیں۔ ہرجائیت اور بے صبری ایک عاشق کا شیوہ نہیں۔ میر کی اس غزل میں بلکہ اُن کی پوری شاعری میں ایک مکمل عاشق نظر آتا ہے جو صابر ہے، مستقل مزاج ہے۔ دل پھینک نہیں ہے۔ اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

پوری غزل میرؔ کی شاعری کے اوصاف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں سادگی بھی ہے، تصوف کا رنگ بھی ہے، عشق کی حکمرانی بھی ہے، سوز و گداز ہے، دلکشی ہے، خیالات کی نیرنگی بھی ہے، سلاست اور معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

اشعار کی ترتیب بھی غزل کے مزاج کو معتدل رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس غزل میں اشعار کی ترتیب نے غزل کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ میرؔ نے اپنے غم کو زمانے کا غم بنا دیا اور زمانے کے غم کو اپنے اندر اس طرح سمولیا کہ اُسے امر کر دیا۔ مندرجہ بالا غزل میرؔ کی زندگی، معاشرتی حالات، عشق اور حسن کے بارے میں میرؔ کے تصورات اور نظریات کو نمایاں کرتی ہے۔

غزل......2

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

مجنوں و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

کیونکر کہیں کہ شہرِ وفا میں جنوں نہیں
اس خصمِ جاں کے سارے دوانے ہیں یہاں کے لوگ

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

تو ہم میں اور آپ میں مت دے کسی کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کامِ جاں کے لوگ

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئی بتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ

تشریحات

شعر....1

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

غافل: لاپروا، بھول جانے والا **رفتنی:** مسافر **کارواں:** کافلہ

وضاحت

انسان اس دنیا میں ایک مسافر کی مانند ہے اور اس نے لوٹ کر جانا ہے مگر لوگ دنیا کی دلکشی میں اپنی اصل منزل بھول جاتے ہیں اور غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرؔ انسان کو آخرت کی فکر کرنے کی تاکید کر رہے ہیں۔

شعر....2

مجنوں و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

مجنوں: ایک رومانوی داستان کے کردار کا نام **کوہکن:** فرہاد کی طرف اشارہ ہے
تلف ہونا: ختم ہونا، ضائع ہونا

وضاحت

عشق جان لیوا مرض ہے اور عشق میں جان قربان کرنا عاشق کے لیے ایک اعزاز ہے۔ مگر سچا عاشق اگر مر بھی جائے تو اُس کا عشق اور اُس کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا ہے بلکہ امر ہو جاتا ہے جیسے فرہاد اور مجنوں کا نام آج بھی زندہ ہے۔

شعر....3

کیونکر کہیں کہ شہرِ وفا میں جنوں نہیں
اس خصمِ جاں کے سارے دوانے ہیں یہاں کے لوگ

خصمِ جاں: شوہر (مراد محبوب ہے) جان کا دشمن

وضاحت

عشق میں جان قربان کرنا عاشق کی معراج ہے اور ہر عاشق اپنی جان کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس میدان میں قدم رکھتا ہے اور یہی وفا کا مقام ہے۔

شعر....4

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

دلبراں: پیارے لوگ (مراد محبوب)

وضاحت

جب تک میرا محبوب میرے دل میں بستا تھا تو میرا دل آباد تھا۔ اب اُس کے دل سے چلے جانے کے بعد یہ دل ایک ویران جگہ ہے۔ عاشق کی خوشی محبوب کی یاد سے وابستہ ہے اور اُس کی یاد کے بغیر دل ایک کھنڈر ہے۔

شعر....5

تو ہم میں اور آپ میں، مت دے کسی کو دخل
ہوتے ہیں فتنہ ساز یہی درمیاں کے لوگ

فتنہ ساز: فساد پھیلانے والے، جھگڑا کروانے والے

وضاحت

اے محبوب تیرے اور میرے درمیان کسی دوسرے شخص کا دخل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہی لوگ ہمارے درمیان نفرتیں پھیلانے کا سبب بنیں گے۔ اس لیے ہمارے پیار میں کسی تیسرے انسان کا آنا اچھا نہ ہوگا۔

شعر....6

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کامِ جاں کے لوگ

کامِ جاں: بہت عزیز، پیارا

وضاحت

میرے محبوب پر جان چھڑکنے والوں کی کمی نہیں، مگر عشق کے مقام و منزلت سے کم ہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں اور میرے عشق کا مقام سب سے بلند ہے۔ میرے محبوب کو چاہیے کہ وہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کرے۔

شعر....7

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرمِ روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

محرم: جاننے والا　　　**بدگماں:** غلط فہمی کا شکار

وضاحت

میرے محبوب کے بے وفا ہونے کے باوجود جو لوگ بھی اُس کو چاہتے ہیں، اُس سے محبت کرتے ہیں وہ صرف اُسی کو ہی دیکھتے ہیں کسی اور کو دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ محبوب کے حسن کی جادوئی تاثیر کا ذکر ہے۔

شعر...8

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

خوش اعتقاد: جلد مان جانے والے، خوش عقیدہ لوگ

وضاحت

میؔر نے ہندوؤں سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ وہ ایک پتھر کے بُت کو خدا مان لیتے ہیں جس کو وہ خود بناتے ہیں۔ ایک طرح کا طنز ہے اور دوسرے حوالے سے اگر بُت کو محبوب سمجھ لیا جائے تو بھی محبوب کی محبت میں میؔر نے ایک حد تک جانے کا مشورہ دیا ہے اور حد سے بڑھ جانے والے نقصان اٹھاتے ہیں۔

شعر...9

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بتاں کے لوگ

فردوس: جنت　　　**سیر چشم:** جس کی آنکھوں میں بھوک لالچ نہ ہو، فیاض لوگ

وضاحت

عاشق کے لیے محبوب کا دروازہ اور اُس کی گلی دنیا کی سب سے اہم اور دلکش جگہیں ہیں۔ میؔر کہتا ہے جس عاشق کو دیدارِ یار نصیب ہو، اُس کی گلی میں جگہ مل جائے وہ جنت کو بھی ٹھکرا دے گا۔ تخیلِ عشق کی بلند پروازی ہے۔

شعر....10

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

عشق پیشگاں: عشق کرنے والے، عشق کو سمجھنے والے

وضاحت

یہ عشق کرنے والے لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں کہ اپنے محبوب پر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ میؔر نے خدا سے پوچھا ہے کہ یارب یہ لوگ کون ہیں جو اتنا مشکل کام اتنی آسانی سے کر دیتے ہیں۔ شعر میں عاشق کی عظمت مقصود ہے۔

شعر....11

منہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میرؔ محو ہیں میری زباں کے لوگ

وضاحت

میری شاعری ہر ایک کو سمجھ نہیں آنے والی اس لیے اکثر مجلسوں میں لوگ میرا منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور اُن کو میرے اشعار کی تفہیم نہیں ہو پاتی۔ میرؔ نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے۔

تجزیاتی نوٹ......غزل نمبر 2

کلاسکی شعرا کے ہاں تصوف' حسن اور عشق' شاعری کے بنیادی اجزا کے طور پر سامنے آتے ہیں۔تصوف کے کئی درجات اور اقسام ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں تصوف ان کے ہاں موجود رہا ہے۔اسی طرح حسن اور عشق کے بھی کئی مدارج ہیں جو کسی نہ کسی صورت میں کلاسیکی شعرا کا موضوع رہا۔ زیرِنظر غزل میں بھی کم و بیش یہی نظریات موجود ہیں جو کلاسیکی شعرا کا طرۂ امتیاز ہیں۔

میر کے ہاں دنیا کی بے ثباتی کا موضوع سب سے اہم ہے۔اس غزل کا آغاز ہی زندگی کی ناپائیداری سے ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ ''عصر کے وقت کی قسم انسان نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔''

انسان دنیا میں آ کر آخرت کو بھول جاتا ہے جو کہ اُس کی اخروی زندگی کے لیے نقصان کا باعث ہے۔میر بھی اسی بات پر زور دے رہے ہیں۔

غزل میں عشق کرنے والوں کی صفات کا تذکرہ بھی ہے کہ عشق انسان کو موت سے بے نیاز کر دیتا ہے اور عاشق کے لیے موت کا خوف بے معنی ہے۔اُس کے لیے سب کچھ اُس کا عشق' چاہت اور محبوب ہوتا ہے اور عاشق موت کو ہنس کر گلے لگا لیتے ہیں۔عشق وہاں ہوتا ہے جہاں حسن ہوتا ہے اور حسن کا لفظی معنی بے عیب ہوتا ہے اور حسن کا موضوعی تصور یہ ہے کہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ ہیرے کی قدر کوئی جوہری ہی کر سکتا ہے اسی طرح حسن کی پہچان بھی اہلِ نظر کو ہی ہوتی ہے۔دیکھنے والے کی آنکھ حسن کو پہچان لیتی ہے۔اسے تناسب کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشیا بھی حسین ہوں اور دیکھنے والے کی آنکھ میں بھی حسن ہو۔

میر نے اس زیرِنظر غزل میں حسن اور عشق کے ان نظریات کو بخوبی برتا ہے۔اس کے علاوہ جنون کی کیفیت عاشق کا حسن ہے اور جنونِ عشق کی آخری منزل ہے۔میر کی شاعری میں جنون دیوانگی اور نفیِ ذات اہم ترین موضوعات ہیں۔

جب انسان اپنی ذات کی نفی کر لیتا ہے تو پھر جنون طاری ہو جاتا ہے پھر زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔بس عشق زندہ رہتا ہے۔

تصورِ رقیب کلاسیکی شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔رقیب کے تصور کو کئی حوالوں سے استعمال کیا گیا اور بعض اوقات تو

محبوب کے جسم پر سجاوٹ کی اشیاء کو بھی اپنا رقیب تصور کیا گیا اور اُس پر رشک کیا گیا۔ رقیب کا تصور صرف قابلِ رشک ہی نہیں بلکہ قابل نفرت بھی ہے کیونکہ عاشق اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص کو محبوب کے قرب میں نہیں دیکھ سکتا جیسے اُس کا محبوب بھی عزیز رکھتا ہو۔ زیرِ نظر غزل میں میرؔ نے رقیب کو قابلِ نفرت کردار کے طور پر پیش کیا ہے کہ رقیب کا وجود محبوب سے دوری کا باعث ہے۔

میرؔ کی شاعری میں مذہب کا عمل دخل نہیں ہے وہ انسانوں کو مذہب یا ذات کی بنیاد پر نہیں پرکھتے بلکہ میرؔ کا مذہب تو انسانیت ہے۔ ان کے نزدیک انسان اہم ہیں اُن کا فکری یا مذہبی نظریہ اہم نہیں ہے۔ زیرِ نظر غزل میں بھی وہ انسانی رویوں اور جذبوں کو اہمیت دے رہے ہیں۔ میرؔ کے نزدیک ایک عاشق کا مذہب دین، دھرم سب کچھ اُس کا محبوب ہوتا ہے۔ عاشق اس کائنات کی قیمتی سے قیمتی چیز کو بھی محبوب کی ایک عنائت کی (محبت کی) نظر پر قربان کر دیتا ہے۔ اُس کی جنت محبوب کا قرب اور وصال ہے۔

غزل کا اختتام میرؔ اپنے عہد کے لوگوں سے گلے کی صورت میں کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو شاعری اور اُس کے محاسن سے آگہی نہیں ہے اور یہ لوگ شاعری کی رموز کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مندرجہ بالا غزل میرؔ کے مخصوص انداز اور خصوصیات کی حامل ہے اور کلاسیکی انداز کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

پیدائش: دسمبر 1797ء آگرہ۔ وفات: فروری 1869ء دہلی

غالبؔ بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تو چچا نے پرورش کی ذمہ داری لی مگر غالب جب آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو چچا بھی انتقال کر گئے تو نواب احمد بخش خان نے مرزا کے خاندان کا انگریزوں کی حکومت سے وظیفہ مقرر کرایا۔ تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی کر دی گئی۔

غالب نے شاہانہ طبیعت پائی تھی اور ساری عمر آمدنی سے اخراجات زیادہ رہے۔ پنشن میں اضافے کے لیے انہوں نے کانپور، کلکتہ اور لکھنؤ کا سفر بھی کیا اور عدالت میں مقدمہ بھی دائر کیا، مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تمام عمر مالی مشکلات کا سامنا رہا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر انہوں نے خلافِ طبیعت لال قلعہ میں ملازمت بھی کی مگر دلّی کی تباہی کے بعد یہ ملازمت بھی جاتی رہی۔ غالبؔ زندگی کے آخری ایام تک حالات بہتر بنانے کی کوشش میں سرگرداں رہے۔

غالبؔ دنیائے شاعری کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ابتدا میں فارسی شاعر بیدلؔ سے متاثر ہو کر مشکل پسندی اختیار کی مگر انہیں بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا کہ

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

غالبؔ نے غزل کو جو وسعت عطا کی اور جو عروج بخشا اس کے بعد میں آنے والے کسی شاعر کے لیے ممکن نہ تھا کہ اس میں کوئی اضافہ کرتا۔ غالبؔ کی شاعری میں فلسفہ، خیال انگیزی، فکر آفرینی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے۔ ان کا ظریفانہ لب و لہجہ ان کے کلام میں لطافت اور خوبصورتی پیدا کرتا ہے۔ انہوں نے حسن و عشق کے مضامین انوکھے اور دلنشیں انداز میں بیان کیے ہیں۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

غالبؔ کی شاعری ایک آئینہ ہے جس میں فرد اپنی اور اپنے گرد و پیش کی تصویر دیکھ سکتا ہے۔ غالب کی شاعری میں بے پناہ وسعتیں ہیں۔ غالب نے قدما کی روایت سے ہٹ کر اپنی شاعری میں ایک نئی دنیا آباد کی۔ حالی کہتے ہیں کہ جب میرؔ

اور سودا کا کلام دیکھ کر ایک جیسے موضوعات سے انسان اکتا جاتا ہے تو مرزا کا دیوان انسان کو نئی دنیاؤں کی سیر کرواتا ہے۔ اس وسعت اور تنوع کا سبب مرزا کی متنوع زندگی اور گوناگوں تجربات ہیں، غالب نے مسرت سے لے کر مایوسی اور ناکامی کی ساری منزلیں طے کیں اور ایک مکمل انسان بن کر شاعر میں ایک مکمل زندگی کا احساس پیش کرتے ہیں۔ غالب جتنا آج سے ایک سو پچاس سال پہلے اہم تھا آج اُس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

غزل.....1

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اِن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی، گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

ان انسان کو نئی دنیاؤں کی سیر کرواتا ہے۔ اس
ں نے مسرت سے لے کر مایوسی اور ناکامی کی
حساس پیش کرتے ہیں۔ غالب جتنا آج سے

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مِرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار؟
جو مِری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

تشریحات

شعر....1

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

نمایاں ہونا: ظاہر ہونا　**صورتیں:** حسین لوگ　**پنہاں:** چھپا ہوا

وضاحت

جو حسین لوگ اس خاک (مٹی) میں دفن ہیں وہ سارے تو نہیں مگر ان میں سے کچھ لالے کے پھولوں کی شکل میں زمین سے پھر نمودار ہو گئے ہیں۔ غالب نے موت کے فلسفے کو بیان کیا ہے کہ لوگ مٹ جاتے ہیں مگر حسن زندہ رہتا ہے۔

شعر....2

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

رنگا رنگ: مختلف، طرح طرح کی　**بزم آرائیاں:** سجی ہوئی محفلیں

نقش و نگار: سجاوٹ کا سامان　**طاقِ نسیاں:** کوئی چیز رکھ کر بھول جانا

وضاحت

ایک زمانہ تھا جب ہم بھی محفلوں کی زینت بنتے تھے اور ان رنگین محفلوں کو سجانا اور ان کا حصہ بننا ہمیں بھی آتا تھا مگر اب وہ باتیں خواب کی طرح ہو گئی ہیں یعنی ماضی کا حصہ بن گئی ہیں۔ اب نہ وہ محفلیں اور نہ ہماری وہ جوانی اور رعنائی۔

شعر....3

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

گردوں: آسمان　**بنات:** بنت کی جمع، بیٹیاں

بنات النعش: سات سہیلیاں　**عریاں:** برہنہ

وضاحت

پورا دن آسمان پر نظر آنے والی سات سہیلیاں پردے میں چھپی رہیں۔اب رات کو ان کے دل میں کیا بات آئی جو سامنے آ گئی ہیں۔ غالب نے شمال کی طرف نظر آنے والے سات ستاروں کے جھرمٹ کو سات سہیلیاں کہا ہے اور ایک خوبصورت اور شاعرانہ خیال پیش کیا ہے۔

شعر....4

قید میں یعقوبؑ نے لی، گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

روزن: روشن دان، سراخ　　**زندان:** قید خانہ　　**روزنِ دیوارِ زنداں:** مراد، بے نور ہو گئیں

وضاحت

حضرتِ یعقوب نے قید خانے میں تو حضرت یوسف (حضرت یعقوب کے بیٹے) کی خبر نہ لی مگر ان کی آنکھیں رو رو کر بے نور ہو گئیں۔قید خانے کے روشن دان کو غالب نے حضرت یعقوب کی آنکھوں سے ملایا ہے۔صنعتِ تلمیح کا دُہرا استعمال ہے۔

شعر....5

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

زنان: زن کی جمع، عورتیں　　**محو ہونا:** کھو جانا، مست ہو جانا

کنعاں: وہ شہر جہاں حضرت یوسف رہتے تھے، آپ کو ماہِ کنعان کہا جاتا ہے۔یعنی کنعان کا چاند

وضاحت

یہ عشق کا دستور ہے کہ عاشق اپنے رقیب سے ناخوش ہوتا ہے (جلتا ہے) مگر حضرتِ زلیخاں (عزیز مصر کی بیوی) اپنی رقیب عورتوں سے اس لیے خوش ہیں کہ وہ بھی حسنِ یوسف کی گرویدہ ہو گئیں۔

(حضرتِ زلیخاں نے مصر کی عورتوں کو دعوت پر بلایا تھا اور ہاتھ میں تیز دھار چھریاں اور ترنج (پھل) پکڑا دیے۔جیسے ہی وہ عورتیں ترنج کاٹنے لگی تو حضرتِ زلیخاں نے حضرت یوسف کو وہاں سے گزار دیا۔آپؑ کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر وہ عورتیں اس قدر مست ہو گئیں کہ انہوں نے ترنج کے بجائے اپنی انگلیاں کاٹ لی۔اصل میں حضرت زلیخاں اپنی سہیلیوں کو متاثر کرنا چاہتی تھیں جوان کو ایک غلام کے عشق میں مبتلا ہونے کے طعنے دیتی تھیں۔)

شعر....6

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

جوئے خون: خون کی ندی' (خون کے آنسو مراد ہیں) **شامِ فراق:** ہجر کی شام **فروزاں:** روشن

وضاحت

جدائی کی رات تاریک بھی ہوتی ہے اور اداس بھی۔ غالب کہتے ہیں کہ جدائی کی شام اگرچہ بہت تاریک ہے مگر میری آنکھوں سے خون کی ندیاں (آنسو) بہہ رہی ہیں اس لیے ان خون کی ندیوں نے شمع کی صورت اختیار کرلی ہے اور تاریکی ختم ہوگئی ہے۔ خون روتی ہوئی آنکھوں کو شمع کے ساتھ تشبیہ دے کر غالب نے شعر میں حسن پیدا کیا ہے۔

شعر....7

اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

پری زاد: خوبصورت چہرے' خوبصورت خواتین **انتقام:** بدلہ **خلد:** بہشت

وضاحت

(یہ ایک تصور ہے کہ نیک عورتوں کو اگلے جہاں میں حوریں بنادیا جائے گا) غالب نے اسی تصور کے پیش نظر کہا ہے کہ یہ خوبصورت پری چہرہ معشوق (عورتیں) اگر کہیں اگلے جہان میں حوریں بن گئیں تو ہم ان سے چن چن کر بدلہ لیں گے جو ظلم یہ اس دنیا میں ہم (مردوں) پر روا رکھے ہوئے ہیں۔

شعر....8

نیند اس کی ہے' دماغ اس کا ہے' راتیں اس کی ہیں
تیزی زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

زلفوں کا پریشان ہونا: چھیڑ چھاڑ میں زلفوں کا کھل جانا/ کھلے ہوئے بال

وضاحت

غالب نے وصالِ یار کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے کہ اے محبوب اُس شخص سے خوش نصیب اور کون ہوسکتا ہے' جس کے بازوؤں اور شانوں پر تیری زلفیں بکھر گئیں۔ وصالِ یار کی تصویر کاری کی معراج ہے۔

شعر....9

میں چمن میں کیا گیا' گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مِرے نالے غزل خواں ہو گئیں

دبستان: مدرسہ' مکتب **غزل خواں:** غزل سنانا **نالہ:** فریاد' آہ وزاری

وضاحت

میں جب باغ میں جاتا ہوں تو میری غزلیں سن کر بلبلیں بھی گیت گانا شروع کر دیتی ہیں' غزلیں پڑھنا شروع کر دیتی

ہیں تو میرے جانے سے باغ ایک مدرسے کی شکل اختیار کر جاتا ہے جیسے استاد کی موجودگی میں بچے پڑھتے رہتے ہیں۔ صنعتِ تشبیہ کا خوبصورت استعمال ہے۔

شعر....10

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار؟
جو مِری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

کوتاہیِ قسمت: بری قسمت، بدقسمتی　　**مژگاں:** پلکیں

وضاحت

میرے محبوب کی شرم سے جھکی ہوئی نگاہیں میرے دل کے پار ہو رہی ہیں۔ پلکوں کو تیرِ نظر بھی کہا جاتا ہے مگر یہاں پلکوں کا جھک جانا عاشق کو مرعوب کر رہا ہے۔

شعر....11

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

بسکہ: زیادہ، باربار　　**پے بہ پے:** لگاتار　　**چاکِ گریباں:** پھٹا ہوا گریبان

بخیہ: سلائی کی ایک قسم، مراد سینا

وضاحت

میں نے اپنے دل میں ابھرنے والی آہوں کو بار بار دبایا مگر وہ بار بار ابھرتی رہیں۔ یوں یہ عمل جاری رہا حتیٰ کہ میری آہوں کا ابھرنا اور دبانے کا عمل میرے پھٹے ہوئے گریبان کو سینے (بخیے) کا باعث بن گیا۔ آہوں کے اٹھنے اور دبانے کے عمل کو سینے سے ملانا رعایتِ لفظی ہے۔

شعر....12

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

دربان: دروازے پر کھڑا ہونے والا محافظ

وضاحت

میں محبوب کے دروازے پر گیا تو دروازے پر کھڑے ہوئے دربان کو دعائیں دیتا رہا۔ اب محبوب سے سامنا ہوا ہے تو طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کا کیا جواب دوں؟ دعائیں تو ساری دربان کو مل گئیں۔ شعر میں گالی کے بدلے دعا دینے سے خوبصورتی پیدا ہوئی ہے۔

شعر....13

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جاں فزا: زندگی بڑھانے والا، تسکین دینے والا　**بادہ:** شراب　**رگِ جاں:** شہ رگ

وضاحت

شراب جاں فزا شے ہے۔ اس سے زندگی بڑھتی ہے اور اگر ہاتھ میں شراب کا جام ہو تو ہاتھ کی سب لکیریں شاہ رگ بن جاتی ہیں۔ شعر میں شراب کی تعریف ہے اور پینے والے کے لیے تسکین کا ذکر ہے۔ ایسے اشعار غالب کی شاعری میں بہت زیادہ ہیں۔ شراب کے رنگ کی وجہ سے ہاتھ کی لکیروں کا سرخ ہو جانا مقصود ہے۔

شعر....14

ہم موحد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

موحد: توحید پرست، خدا کو ایک ماننے والا　**کیش:** طریقہ　**ملتیں:** قومیں، فرقے

رسوم: رسم کی جمع　**اجزائے ایماں:** ایماں کے اجزا، ارکان

وضاحت

غالب نے اس شعر میں موحد (توحید پرست) ہونے کا دعویٰ کیا ہے ان کے نزدیک باقی سب کچھ جو ارکانِ مذہب یا دستور ہیں وہ رسمیں ہیں اور اُن کو مٹانا ہی مقصود ہے۔ ان کے نزدیک مذہب رسموں کو مٹانے کا نام ہے۔ توحید پرست لوگ، رسموں اور رواجوں کو مذہب کا حصہ نہیں مانتے ان کے لیے سب کچھ خدا کی ذات ہے اور بس۔

شعر....15

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

خوگر: عادی

وضاحت

انسان کسی بھی چیز کا عادی ہو جائے تو وہ چیز اس کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ غالب کہہ رہے ہیں کہ مجھ پر اتنی مشکلات آئیں، اتنے دکھ میں نے اٹھائے کہ اب میری طبیعت ان غموں کی عادی ہو چکی ہے اب کوئی تکلیف مجھے تکلیف نہیں لگتی۔

<u>شعر....16</u>

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ویراں: اجڑی ہوئی' خالی

<u>وضاحت</u>

اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو اَے دنیا والو! یہ بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ خالی ہو جائیں گی۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ غالب کے رونے سے ان بستیوں میں سیلاب آ جائے گا اور لوگ یہاں سے اٹھ کر چلے جائیں گے۔ حد سے زیادہ رونا بستیوں کو ویران کر دیتا ہے۔

تجزیاتی نوٹ......غزل نمبر 1

زیرِ نظر غزل غالب کی اہم ترین غزلوں میں سے ایک ہے۔ دیوانِ غالب میں ردیف ''ن'' کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ردیف ''ن'' میں اس غزل کو اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح ہم سب جانتے ہیں کہ غالبؔ کا اشیاء اور مظاہر کو دیکھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کا انداز اچھوتا ہے اسی طرح اس غزل میں بھی غالب نے اپنے مخصوص انداز میں اشیاء اور مظاہر سے نتائج اخذ کیے ہیں۔

غالب کا یہی انداز ان کو دوسرے شعرا سے مختلف اور ممتاز کرتا ہے۔ اس میں ان کے فلسفۂ زندگی اور تخیل کی بلند پروازی کا عمل دخل ہے۔ ان کی سوچ کا محور بہت وسیع اور بلند ہے اور وہ ایک عام سے موضوع کو خاص بنانے کا گُر خوب جانتے ہیں۔ غزل کے آغاز میں غالب نے جو نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ پھولوں کا حسن اصل میں ان حسین لوگوں کی وجہ سے ہے جو زیرِ زمین دفن ہو چکے ہیں۔ یہ ایک نیا اور اچھوتا خیال ہے اور یہی اچھوتا پن غالب کی پہچان ہے۔

غالب کے ہاں شاعری کا فن اپنے معراج پر نظر آتا ہے۔ وہ صنائع بدائع کے استعمال میں بھی مختلف ہیں۔ زیرِ نظر غزل میں صنعتوں کا استعمال بڑی خوبصورتی اور انوکھے انداز میں کیا گیا ہے۔ غزل میں صنعتِ حسنِ تعلیل، مراۃ النظیر، صنعتِ تضاد، تشبیہ اور استعارہ کا استعمال کر کے غالب نے غزل کو خوبصورت بنا دیا ہے جس سے غزل کی اہمیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔

غزل کے پہلے اور تیسرے شعر میں حسنِ تعلیل کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے اسی طرح دن اور رات میں صنعتِ تضاد کا استعمال ہے۔

غالب کے ہاں تصورِ رقیب بھی اچھوتے اور الگ انداز میں پایا جاتا ہے اور غالب نے رقیب کے تصور میں بہت تجربے کیے ہیں یہ انہیں کا خاصا ہے۔ جس طرح غالب نے تصورِ رقیب کا استعمال کیا ہے، کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا۔ زیرِ نظر غزل میں غالب نے حضرتِ زلیخا کے واقعے میں رقیب کا تصور بالکل ایک انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اور رقیب کے عمل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ رقیب کے تصور کی ایک بالکل جداگانہ مثال ہے۔

تصوف، عشق اور حسن کلاسیکی شاعری کے بنیادی اجزا ہیں مگر غالب نے ان تصورات کو اپنے تخیل کی بلند پروازی کی بنیاد پر نئے اور انوکھے انداز میں پیش کیا۔ غالب حسن کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر روایتی عاشق کی طرح محبوب کے پاؤں نہیں داب‍تے بلکہ اگر ممکن ہو تو محبوب سے بدلہ لینے کی بھی ٹھان لیتے ہیں یہاں نہیں تو اگلے جہاں میں ہی سہی۔ غالب کا محبوب

گوشت پوست کا انسان ہے اور وہ حسن کی تعریف ہو یا وصل کا موقع ہر جگہ پر حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں بات گھما کر نہیں کرتے۔

غالب حسنِ محبوب میں آنکھوں اور پلکوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان پلکوں کے وار کبھی ''تیرِ نیم کش'' کی شکل میں ہوتے ہیں اور کبھی ''تلوار'' کی صورت میں مگر غالب کی ادائیگی بات میں نیا حسن پیدا کرتی ہے۔

غالب فطرت کے حسن کا ذکر بھی کرتے ہیں اور چمن' گلستان' بلبل اور نالے جیسے الفاظ سے تشبیہ اور استعارہ کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔

زیرِ نظر غزل میں غالب نے بنیاد پرستی، پرانی رسموں کو ترک کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ غالب جدید خیالات اور نظریات کا شاعر ہے اس لیے آج بھی اُس کی باتیں عہدِ حاضر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

غالب زندگی کو اُس کے حقیقی روپ میں دیکھتے ہیں اور حقائق سے پردا اٹھاتے ہیں۔ عشق اور حسن کے دائرے سے باہر نکل کر بھی سوچتے ہیں اور ''غمِ روزگار'' کو بھی زیرِ بحث لاتے ہیں۔ وہ غمِ جاناں کو غمِ دوراں میں تبدیل کرتے ہیں۔ غالب کی متذکرہ غزل اہم غزلوں میں سے ایک ہے جس میں بلاغت اور لطافت کے دریا بہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تشبیہات' استعارات اور صنائع کے خوبصورت استعمال سے غزل کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

غزل.....2

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر؟
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم، نکلے

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

خدا کے واسطے، پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو، یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تشریحات

شعر....1

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

ارمان: خواہش،امیدیں

وضاحت

خواہشات ہر زندہ انسان کے دل میں مچلتی رہتی ہیں اور اگر ایک خواہش پوری ہو جائے تو اُس کی جگہ دوسری لے لیتی ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ انسان خواہشات کی تکمیل سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ غالب اسی نفسیاتی مسئلہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

شعر....2

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بہ دم نکلے

چشمِ تر: روتی ہوئی آنکھ

وضاحت

میرے قاتل کو اس بات کی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ میرے قتل کے بعد اُس کی گردن پر میرے خون کا ذمہ رہے گا کیونکہ میرے جسم میں تو خون ہے ہی نہیں جس کی ذمہ داری اٹھانی پڑے میرے جسم کا خون تو آنکھوں کے ذریعے بہہ گیا ہے۔ حسنِ تحلیل کا خوبصورت استعمال ہے۔

شعر....3

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

خُلد: جنت **بے آبرو:** بے عزت

وضاحت

حضرت آدمؑ کا جنت سے نکالا جانا سب پر عیاں ہے مگر جس طرح بے عزت ہو کر ہم تیری گلی سے نکلے ہیں اُس کی مثال نہیں ملتی۔صنعتِ تلمیح کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔

شعر....4

بھرم کھل جائے ظالم ترى قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

بھرم کھل جانا: بات واضح ہو جانا' خوش فہمی دور ہو جانا **قامت:** قد **طرّۂ پر پیچ وخم:** زلفوں کا پھیلنا/کھلنا

وضاحت

اگر تیری زلفوں کو کھول دیا جائے جو کہ لپٹی ہوئی ہیں تو تیرا دراز قد چھوٹا لگنے لگے گا۔محبوب کی زلفوں اور قامت کی تعریف ہے۔اور سراپا نگاری ہے۔

شعر....5

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے' کان پر رکھ کر قلم' نکلے

وضاحت

میرے محبوب کو بہت سے لوگ خط لکھتے ہیں اس لیے میں نے خط لکھنے والے (منشی) کا روپ دھار لیا ہے کہ جس نے بھی (میرے محبوب کو) خط لکھنا ہو وہ مجھ سے لکھوائے۔تا کہ مجھے اندازہ ہو کہ میرے محبوب کو کون کون چاہتا ہے اور کیا کہتا ہے؟

شعر....6

ہوئی اس دَور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ' جو جہاں میں جامِ جم نکلے

بادہ آشامی: شراب نوشی **دَور:** عہد **جامِ جم:** جمشید کا پیالہ

وضاحت

غالب اپنا موازنہ ایران کے بادشاہ جمشید سے کر رہے ہیں جس کا جام (پیالہ) دنیا بھر میں مشہور تھا وہ اس میں شراب بھی پیتا تھا اور اُس پیالے کے اندر دنیا کو دیکھا کرتا تھا۔(جادو کا پیالہ تھا) غالب کہہ رہے ہیں کہ شراب پینے میں میرا کوئی ثانی نہیں۔یہ جمشید کا دور تو بعد میں آیا آغاز میں نے کیا۔یہ غالب کا انداز ہے کہ وہ اپنے آپ کو شراب پینے کے حوالے سے نمایاں کرتے ہیں۔

شعر....7

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

خستگی: کمزوری، بیماری

وضاحت

مجھے جن لوگوں سے امید تھی کہ وہ مشکل میں میرا ساتھ نبھائیں گے مگر وہ تو مجھ سے بھی زیادہ لاغر ہیں۔ غالب زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر کوئی دکھی ہے کوئی بھی خوش نہیں ہے۔

شعر....8

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں، جس کافر پہ دم نکلے

کافر: مراد، محبوب

وضاحت

جس محبوب کو دیکھ کر ہم جیتے ہیں وہی ہماری موت کا سبب بھی ہے۔ غالب بتا رہے ہیں کہ عشق میں مرنا اور جینا ایک جیسا ہی ہے۔ جس کو دیکھ کر چین ملتا ہے اُسی کی جدائی موت کا سبب بن جاتی ہے۔

شعر....9

خدا کے واسطے، پردہ نہ کعبہ سے اُٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو، یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

صنم: پتھر کا بت، مراد محبوب

وضاحت

عاشق کو ہر چیز میں محبوب کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ خواہ وہ بت خانہ ہو یا کعبہ اس لیے غالب روک رہے ہیں کہ کعبے کا پردہ مت اٹھائیں کہیں اس کے اندر سے بھی محبوب کا دیدار نہ ہو جائے۔ عشق میں مبالغہ کی بلکہ غلو کی صورت ہے۔

شعر....10

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مے خانہ: شراب خانہ　　**واعظ:** نصیحت کرنے والا، مراد مُلا

وضاحت

غالب نے واعظ کی اصلیت کھول کر رکھ دی ہے کہ وہ لوگ جو بظاہر نیک بنتے ہیں اس اصل میں وہ بھی شراب نوش ہیں مگر وہ چھپ کر یہ کام کرتے ہیں اور میں ظاہر اور سب کے سامنے۔ مُلا کی دوہری شخصیت سے پردہ اٹھایا ہے۔

تجزیاتی نوٹ.......غزل نمبر2

ڈاکٹر سید عبداللہ کے بقول: غالب نے سو سال پہلے پیدا ہو کر جو غلطی کی تھی اُس کی سزا اُسے بھگتنا پڑی کہ اُس کے کلام کو بے معنی کہا گیا۔ غالب دراصل ایک سو سال بعد کا شاعر ہے۔ غالب کے تصورات اور اشعار آج کے جدید انسان کے خیالات اور توقعات پر پورا اترتے ہیں اور آج اکیسویں صدی میں بھی غالب کی باتیں عہدِ حاضر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

زیرِ نظر غزل میں غالب نے خالص انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے۔ غالب کے ہاں زندگی حقیقی رنگ میں نظر آتی ہے۔ اس میں بناوٹ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ خواہشات انسان کی زندگی تک اُس کے ساتھ رہتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو کہتے ہیں کہ اگر انسان کی خواہشات ختم ہو جائیں تو اُس کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔

یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے زندگی بھر سرگرمِ عمل رہتا ہے اور اگر اُس کی ایک خواہش پوری ہو جائے تو دوسری کے لیے مچلنے لگتا ہے اور اسی طرح اُس کی پوری زندگی گزر جاتی ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے باوجود انسان مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اُس کی خواہشات بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

غالب نے زیرِ نظر غزل میں اسی طرح کے احساسات اور انسانی خواہشات کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے لہجے کی داد دینا ہو گی جس طرح انہوں نے انسانی نفسیات کو موضوع بنایا ہے۔ غزل میں خواہشات کی عدم تکمیل پر محرومی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ایک حد تک طمانیت ہے۔ غالب بے چین اور مضطرب نہیں بلکہ ایک مطمئن شخصیت نظر آتے ہیں۔

اس کے علاوہ کلاسیکی شاعری کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب محبوب کے دربار میں عاشق کی کم تری کا ذکر کرتے ہیں مگر اس میں بھی ان کا انداز الگ اور اچھوتا ہے اور غالب کی شاعری میں ہمیں کلاسیکی شعرا کے برعکس محبوب پر کسی قدر تنقید کا رویہ بھی ملتا ہے اور یہ صرف غالب ہی کا خاصا ہے۔ محبوب کی محفل سے نکلنے کو حضرت آدمؑ کے جنت سے نکالے جانے کے ساتھ تشبیہ دینا بھی ایک دلچسپ امر ہے جس سے غزل کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔

شراب اور مستی کا موضوع کلاسیکی شاعری کے چند اہم موضوعات میں سے ایک ہے مگر غالب نے موضوع میں بھی جدت اور تنوع پیدا کیا ہے اور اس موضوع کو بھی بڑے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے۔

عشق میں موت کو گلے لگانا عاشق کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے اور عشق کا خاتمہ بھی موت کے ساتھ مشروط ہوتا

ہے ورنہ عشق نہیں مرتا اور زندہ رہتا ہے۔ غالب نے عشق میں جینے اور مرنے کے فرق کو بڑے دلچسپ انداز سے بیان کیا ہے۔ محبوب کی جدائی ہی عاشق کے لیے موت کا سبب بنی ہے اور اُس کا وصال زندہ رہنے کا باعث بنتا ہے غالب نے اس صورتِ حال کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

واعظ اور ملا سے نفرت بھی کلاسیکی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ واعظ صرف نصیحت کرتا ہے عمل نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کو اچھائی کا درس دیتا ہے مگر اس اصول کو اپنے آپ پر لاگو نہیں کرتا۔ غالب نے اس موضوع میں بھی جدت پیدا کی ہے اور واعظ کی میخانے سے نفرت اور مے پرستی کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔

پوری غزل انسانی جذبات و احساسات کی سچی اور مکمل تصویر ہے اور غالب نے انسانی احساسات اور نفسیات کے فلسفے کو بڑے خوبصورت مگر حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے اور یوں غزل کو امر کر دیا ہے۔

تھی اُس کی سزا اُسے بھگتنا پڑی کہ اُس کے
ورات اور اشعار آج کے جدید انسان کے
ں عہدِ حاضر کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔
حانی کی ہے۔ غالب کے ہاں زندگی حقیقی
قاضا ہے کہ خواہشات انسان کی زندگی تک
تم ہو جائیں تو اُس کی روحانی موت واقع

بھر سرگرمِ عمل رہتا ہے اور اگر اُس کی ایک
رگی گزر جاتی ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل

ت کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے لہجے کی داد
ت کی عدمِ تکمیل پر محرومی کا احساس نہیں ہوتا
نظر آتے ہیں۔
وب کے دربار میں عاشق کی کم تری کا ذکر
ہمیں کلاسیکی شعرا کے برعکس محبوب پر کسی
نکلنے کو حضرت آدمؑ کے جنت سے نکالے
وا ہے۔
ایک ہے مگر غالب نے موضوع میں بھی
ے۔
ں کا خاتمہ بھی موت کے ساتھ مشروط ہوتا

حکیم مومن خان مومنؔ

(1800ء-1851ء)

مومن خان 1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ پورا نام مومن خان ہے اور مومن ہی تخلص تھا۔ مومن کے والد کا نام غلام نبی تھا۔ ان کے دادا مغلیہ دور کے اواخر میں شاہی طبیبوں میں شامل ہوئے اور حکومت سے جاگیر بھی حاصل کی۔ ان کے والد کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے خاص عقیدت تھی۔

دہلی کے ایک خوش حال گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے سبب مومن نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ مومن ایک ذہین طالب علم تھے۔ عربی، فارسی، نجوم، طب اور موسیقی میں کمال حاصل کیا۔ اتنے سارے علوم یکسر دسترس میں ہونا مومن کی ذہانت اور علم دوستی کا ثبوت ہے۔ مومن بنیادی طور پر طبیب تھے مگر دیگر علوم کے ساتھ شطرنج کھیلنے اور تاریخ گوئی میں بھی کمال فن حاصل تھا مگر کسی فن کو پیشہ کے طور پر استعمال نہ کیا۔ گاہے گاہے طبابت اور بزرگوں کی پنشن سے اچھا گزر بسر ہو جاتا تھا۔

1851ء میں مکان کی چھت سے گرے اور اپنے ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھے۔ اس سانحے کی تاریخ بھی خود ہی لکھی جو بعد میں اُن کی وفات کی تاریخ شمار ہوئی۔

مومن ایک عاشق مزاج شاعر تھے۔ ان کا جوانی کا کلام عشق و محبت کی تصویر ہے۔ مومن نے قصیدہ، رباعی، واسوخت، مثنوی، سب اصناف ادب میں طبع آزمائی کی مگر بنیادی طور پر مومن غزل کے شاعر ہیں۔ اپنے آپ کو حسن و عشق تک محدود کر لینے کی وجہ سے ان کی شاعری میں تغزل بھرپور طریقے سے پایا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس خصوصیت کو معاملہ بندی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ معاملہ بندی ان کی ذاتی زندگی کی ترجمان بھی ہے۔

ان کی شاعری میں یک رنگی (یکسانیت) پائی جاتی ہے۔ مومن کی شاعری کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری کا مفہوم پڑھنے والے کو براہ راست سمجھ نہیں آتا بلکہ کچھ غور کرنے کے بعد مطالب تک رسائی ممکن ہوتی ہے کیونکہ مومن سیدھے طریقے سے بات نہیں کرتے۔ اسے دوسرے لفظوں میں ابہام کی کیفیت بھی کہا جاتا ہے۔

ان اعتراضات کے باوجود مومن ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ان کو اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ بہت کم شاعروں کو مومن جیسا مقام ومرتبہ نصیب ہوا۔

مومن کی غزلوں میں بہ اعتبار مضامین وسعت نہیں ہے اور ان کی غزل عشق کی ہی ترجمانی کرتی ہے مگر مومن نے اپنے تجربات میں بڑا تنوع پیدا کیا۔ بات سے بات نکالنا اور معمولی مضامین سے نئے معانی تلاش کرنا مومن کا خاصا ہے۔

مومن زندگی سے پیار کرتے ہیں اور وہ زندگی سے ہر طرح سے لطف اندوز ہونے کا فن جانتے ہیں۔اس لیے ان کی غزل میں شگفتگی، شادابی اور بھرپور مسرت نظر آتی ہے۔

غزل.....1

یہ عذرِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

نہ شادی مرگ ہوں کیونکر ہے مژدہ قتل دشمن کا
کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

ستم اے گرمی ضبط فغاں و آہ چھاتی پر
کبھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا

کیا زنجیر مجھ کو چارہ گر نے کن دنوں میں جب
عدو کی قید سے وہ شوخ بے پردہ نکل آیا

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال آنکھیں
سنا معذور ہے مضطر نکل آیا نکل آیا

ہمارے خون بہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو
یہ بعد انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

ہوئی بلبل ثنا خوانِ دہانِ تنگ کس گل کی
کہ فروردی میں غنچہ کا منہ اتنا سا نکل آیا

کوئی تیر اس کا دل میں رہ گیا تھا کیا کہ آنکھوں سے
ابھی رونے میں اک پیکان کا ٹکڑا نکل آیا

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو
کہ ہر زخم بدن سے خون کا دریا نکل آیا

خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

بہت نازاں ہے تو اے قیس پر وحشت دکھاوں گا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومن کا نکل آیا

تشریحات

شعر....1

یہ عذرِ امتحان جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

عذر: بہانہ

وضاحت

اپنے مقصد میں ناکامیوں کا باعث میں خود ہوں، کوئی اور نہیں ہے۔ یہ شعر روایت سے ہٹ کر ہے۔ عاشق اپنی ناکامی ہمیشہ عدو (دشمن) یا رقیب پر ڈالتا ہے مگر مومن اس کے برعکس اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار اپنے آپ کو ٹھہرا رہے ہیں۔

شعر....2

نہ شادیِ مرگ ہوں کیونکر ہے مژدہ قتل دشمن کا
کہ گھر میں سے لیے شمشیر وہ روتا نکل آیا

مژدہ: خوش خبری **شمشیر:** تلوار

وضاحت

میرا قاتل مجھے قتل کرنے آیا اور ہاتھ میں تلوار پکڑے روتا ہوا واپس چلا گیا۔ اُسے اپنے ظلم کا احساس ہو گیا اور وہ واپس چلا گیا۔ دوسری صورت میں قاتل جب مجھے قتل کر چکا تو رو دیا۔ اُس کا رونا بھی میری کامیابی ہے کہ کم از کم اسے احساس تو ہوا۔ یہ شعر مومن کے خاص انداز کو ظاہر کرتا ہے۔

شعر....3

ستم اے گرمیِ ضبط فغاں و آہ چھاتی پر
کبھو بس پڑ گیا چھالا کبھو پھوڑا نکل آیا

ستم: ظلم **کبھو:** کبھی

وضاحت

دکھوں کو برداشت کرنا آسان کام نہیں۔ اگر انہیں ضبط کر لیا جائے تو یہ چھالوں کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ غم میں

رو لینے سے غم ہلکا ہو جاتا ہے اور ضبط کرنے سے بڑھ جاتا ہے۔ بقول شکیبؔ

حق بات آ کے رک سی گئی تھی کبھی شکیبؔ
چھالے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک زبان پر

شعر....4

کیا زنجیر مجھ کو چارہ گر نے کن دنوں میں جب
عدو کی قید سے وہ شوخ بے پردہ نکل آیا

زنجیر: قید کرنا **چارہ گر:** خیر خواہ، معالج **عدو:** دشمن

وضاحت

مجھے میرے دوستوں نے اس ڈر سے قید کر دیا کہ میں عشق میں جنونی نہ ہو جاؤں مگر افسوس اس بات کا ہے کہ جس دن میں قید ہوا اُسی دن میرا محبوب دشمن (رقیب) کی قید سے رہا ہو کر بے پردہ (بغیر منہ کو ڈھانپے) باہر نکل آیا۔ کاش میرے چارہ گروں نے مجھے اس دن قید نہ کیا ہوتا جس دن میرا محبوب سب کے سامنے اپنا چہرہ لیے آ گیا۔ یہ میری بدقسمتی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

شعر....5

نکل آیا اگر آنسو تو ظالم مت نکال آنکھیں
سنا معذور ہے مضطر نکل آیا نکل آیا

معذور: محروم، اپاہج، مجبور **مضطر:** بے چینی

وضاحت

جب کوئی ظلم کر رہا ہو تو مظلوم کی آنکھ سے آنسوؤں کا نکلنا ایک فطری عمل ہے۔ اس بات پر ظالم کا مزید غصے میں آنا غلط ہے کیونکہ آنسوؤں پر کسی کا ضبط نہیں ہوتا۔ مومن کی غزل میں یہ بھرتی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

شعر....6

ہمارے خون بہا کا غیر سے دعویٰ ہے قاتل کو
یہ بعد انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

خون بہا: قتل کا ہرجانہ **انفصال:** الگ ہو کر، فارغ ہو کر

وضاحت

میرا قاتل (محبوب) میرے قتل کا ہرجانہ میرے رقیب (دشمن) سے مانگ رہا ہے۔ یہ بات مومن کو ناگوار گزری ہے کہ محبوب نے ایک تو قتل کیا اور دوسرا اس قتل کا الزام میرے رقیب پر ڈال دیا۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا کیونکہ محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا میرے لیے اعزاز کی بات تھی اور میرا محبوب مجھ سے یہ اعزاز چھین رہا ہے۔

نکل آیا
نکل آیا

روایت سے ہٹ کر ہے۔ عاشق اپنی ناکامی
پنے آپ کو ٹھہرا رہے ہیں۔

دشمن کا
نکل آیا

اُسے اپنے ظلم کا احساس ہو گیا اور وہ واپس
میابی ہے کہ کم از کم اسے احساس تو ہوا۔ یہ

چھاتی پر
نکل آیا

کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ غم میں

شعر....7

ہوئی بلبل ثنا خوانِ دہانِ تنگ کس گل کی
کہ فروردی میں غنچہ کا منہ اتنا سا نکل آیا

ثنا خواں: تعریف کرنے والا **فروردی:** بہار کا موسم **دہان:** مراد، مُنہ

وضاحت

یہ بلبل نے غنچے کے سامنے کسی پھول کی تعریف کر دی جو بہار کے موسم میں بھی غنچہ پریشان ہو گیا اور اس کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ کسی کی تعریف برداشت کرنا ہر ایک کے بس میں نہیں۔ مومن نے بے معنی موضوع سے معانی اخذ کیے ہیں اور بلبل اور غنچے کے تنگ منہ سے رعایتِ لفظی کا استعمال کیا ہے۔ فروردین کو فروردی ضرورت شعری کے لیے کہا ہے۔

شعر....8

کوئی تیر اس کا دل میں رہ گیا تھا کیا کہ آنکھوں سے
ابھی رونے میں اک پیکان کا ٹکڑا نکل آیا

پیکان: نیزے کا سرا، ٹکڑا، نوک، تیر کا بھالا

وضاحت

محبوب کی نظروں کے تیر میرے سینے میں موجود تھے اور اب جب کہ میں خون رو رہا ہوں تو ان تیروں کے ٹکڑے میری آنکھوں سے نکل رہے ہیں۔ مومن نے نظروں کے تیروں کو اصل تیر بنا کر پیش کیا ہے اور اگر نظروں کے تیر کا اثر آنکھوں سے نکل رہا ہے تو پھر یہ بھی خوب ہے کہ جس چیز (نگاہ) سے وار کیا گیا وہیں (نگاہ) پر اثر ہوا۔

شعر....9

دمِ بسمل یہ کس کے خوف سے ہم پی گئے آنسو
کہ ہر زخم بدن سے خون کا دریا نکل آیا

دمِ بسمل: زخمی ہوتے وقت، قتل ہوتے وقت

وضاحت

ظالم محبوب کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے نہ جانے ہم کیوں اپنے آنسو پی گئے مگر یہ غم جو میں ضبط کر رہا تھا، تھم نہ پایا اور میرے ہر زخم سے خون کا دریا بن کر نکل آیا۔ روایتی انداز کا شعر ہے۔

شعر....10

خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

خدنگ: تیر **ارمان:** خواہش، آرزو

وضاحت

جب میں اپنے محبوب کے ہاتھوں قتل ہوا تو میرے اندر سے جونہی تیر نکالا گیا، میری جان بھی ساتھ ہی نکل گئی اور یہ میری عرصہ دراز سے جو خواہش تھی وہ پوری ہوگئی۔ محبوب کے ہاتھوں قتل ہونا عاشق کی معراج ہے۔ (تیرِ نظر کا ہو یا اصل، بات ایک ہی ہے)

شعر....11

بہت نازاں ہے تو اے قیس پر وحشت دکھاوں گا
کتابوں میں کبھو قصہ جو مومؔن کا نکل آیا

نازاں: فخر کرنا، ناز کرنا

وضاحت

مومن شعر میں فرہاد کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ اے قیس! (فرہاد) تمہیں اپنے عشق کی سچائی پر بہت ناز ہے مگر ایک وقت آئے گا کہ لوگ کتابوں میں جب میرے عشق کے واقعات پڑھیں گے تو تمہیں بھول جائیں گے۔

تجزیاتی نوٹ......غزل نمبر 1

مومن بنیادی طور پر عشقیہ شاعر ہیں اور کلاسیکی شعرا کی روایت کا ایک حصہ ہیں۔ مومن عشق کی مختلف کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا انداز بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ عشق کی یہ روایت ہے کہ عاشق محبوب کے غم میں رنجور اور بے قرار رہتا ہے اور محبوب کی جدائی کا غم عاشق کو نہ صرف غمگین کر دیتا ہے بلکہ اُسے اندر سے کھا جاتا ہے اور پھر عاشق سوائے محبوب کے وصل کے اور کوئی خواہش اپنے دل میں نہیں رکھتا مگر مومن کے یہاں ہمیں عشق کی کیفیت میں گہرے دکھ کا اظہار نہیں ملتا اور بعض اوقات تو یہ صورتحال بھی نظر آتی ہے کہ

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تو نے اچھا کیا نباہ نہ کیا

مومن محبت کی کیفیت میں غم سے نڈھال نظر نہیں آتا بلکہ قدرے تسکین کے عالم میں نظر آتا ہے اور اس کی وجہ ایک تو مومن کا اپنا مزاج ہے اور دوسرا مومن کو میرؔ جیسے حالات کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا جس کیوجہ سے ان کی شاعری میں واہ کی کیفیت ہے، آہ کی کیفیت قدرے کم ہے۔

مومن کا محبوب شوخ اور چلبلا ہے اور مومن بھی اُس کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ مومن دکھ کی بات ہی نہیں کرتے۔ غم ایک ایسا آفاقی عمل ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خاکی انسان غم سے بے نیاز ہو۔ مومن کی شاعری میں درد اور دکھ کے جذبات موجود ہیں مگر وہ اس دکھ کو گلے لگا کر بسترِ مرگ پر نہیں لیٹ جاتے بلکہ انہیں زندہ رہنے کا احساس زندہ دلی پر مجبور کرتا ہے مگر پھر بھی وہ تشریح طلب غزل میں خون کے آنسو پیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ چھپے ہوئے آنسو زخموں کی صورت میں خون اُگل دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر مومن صنعتِ حسنِ تحلیل کا بہت خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔

خدنگ، تیر، تلوار جیسے الفاظ سے شعر مختلف تراکیب کا استعمال کرتے ہیں اور بعض اوقات تو محبوب کی آنکھوں کی پلکیں بھی تیر کا کام کرتی ہیں۔ مومن کے ہاں بھی یہ صورت نظر آتی ہے کہ محبوب کے تیرِ نظر جان سینے سے نکل جاتی ہے۔ یہ رویہ کلاسیکی شاعری کی ایک بنیادی اکائی ہے۔ اس لیے مومن کسی طرح اس سے بچ کر نکل سکتے مگر یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ ان سب باتوں کے باوجود مومن کا لہجہ طربیہ اور نشاطیہ ہے اور سوز، دکھ کے باوجود ہمیں مومن ہنستے ہوئے نظر آتے ہیں، روتے ہوئے نہیں۔

زیرِنظر غزل میں دکھوں کو اس طرح برداشت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ان دکھوں کو دبانے کے باعث جسم پر چھالے اور زخم بن گئے ہیں مگر یہ نظریات ''لفظ برائے شعر گفتن'' کے عکاس ہیں۔ جس طرح غزل میں ایک دوسری جگہ بھی مومن نے غم کے تیر کا ذکر کیا ہے جو دل میں رہ گیا تھا اور آنسوؤں کے ذریعے اس کے ٹکڑے باہر نکل رہے ہیں، یہ غم بھی روایتی ہے اور یہ انداز بھی کلاسیکی شعرا کا شیوہ ہے۔

اگر ہم مومن کی شاعری کا جائزہ لیں تو وہ مکمل طور پر روایتی غزل کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ روایتی الفاظ و تراکیب، روایتی نظریات، روایتی طرزِ عشق اور روایتی انداز ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ مومن نے غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے شاعری کی تو بے جا نہ ہوگا۔

زیرِنظر غزل مومن کے اندازِ بیان اور شاعری کے اوصاف کی ترجمان ہے۔ غزل میں صنفِ تلمیح کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے اور قیس کے ذکر سے خوبصورتی پیدا کی ہے۔ مومن اپنے تخلص کی معنویت کے حوالے سے بھی ذومعنی بات کر جاتے ہیں اور بات میں ان کے نام کے معنی کے باوصف خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔

غزل.....2

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اس کُو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیونکر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھا
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

ہے چھیڑ، اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں، گدگدی سے ہم

وحشت ہے عشق، پردہ نشیں میں دمِ بُکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردہ چشم پری سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

تشریحات

شعر....1

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ٹھانی تھی: پختہ ارادہ کیا تھا **ناچار:** مجبور **جی:** دل

وضاحت

ہم نے اپنے دل میں اس بات کا عہد کیا تھا کہ اب ہم اپنے دوست (فضلِ حق) سے نہیں ملیں گے مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوبارہ اُس کے پاس چلا گیا ہوں۔ میں اپنے دوست سے ناراض نہیں رہ سکتا۔

شعر....2

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

وضاحت

جب ہم اپنے دوست کو رقیبوں سے بات کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا اور ہم رونے لگ جاتے ہیں، کیونکہ اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔ (یاد رہے کہ یہ غزل مومن نے اپنے دوست فضل حق کی یاد میں لکھی تھی جو ان سے کسی وجہ سے ناراض تھے)

شعر....3

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

وضاحت

تم ہی نے تو کہا تھا کہ ہم سے بات مت کیا کرو اور نہ بولنے کی ابتدا بھی تم نے ہی کی تھی۔ اگر یہ بات غلط ہے تو تم خود ہی انصاف کر کے بتاؤ، میں تمہیں ہی منصف مان لیتا ہوں۔

شعر....4

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

شاہد: گواہ **مدعی:** دعویٰ کرنے والا

وضاحت

ہم اگر دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جاتے تو تیری شکایتوں پر کوئی گواہ طلب کرتے کہ تم غلط ہو یا میں، مگر میں تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تیری ہر خطا معاف کر دیتا ہوں۔

شعر....5

اس کُو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

وضاحت

اگر چہ ہمارا جسم اب کمزور اور لاغر ہو گیا ہے مگر یار کی گلی میں مرنا میرا شوق ہے۔ اے آرزو تم ہی میری مدد کرو۔

شعر....6

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

بندگی: عبادت، یہاں دوستی مراد ہے

وضاحت

میرے دوست نے مجھے اپنی بندگی سے آزاد کر دیا۔ اپنے دوست کی محبت میں شاعر اس قدر غرق ہے اور عقیدت مندی کی حد تک جا پہنچا ہے کہ جب سے تم نے مجھ سے ناطہ توڑا ہے، میں تیری بندگی سے آزاد ہو گیا ہوں۔ تیری عقیدت سے میرا دل خالی ہو گیا ہے۔

شعر....7

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

برق: بجلی **برقِ تبسم:** بجلی کے کوندے جیسی مسکراہٹ **ابر:** بادل

وضاحت

رونا ایک فطری عمل ہے اور رونے سے دل کا بوجھ کم ہو جاتا ہے اور اگر انسان رونے کو دبا لے تو یہ بوجھ اور بھی زیادہ ہو

جاتا ہے۔مومن کہتے ہیں جس دوست کو ہم مذاق میں بجلی جیسی مسکراہٹ والا کہتے تھے، اس کے غم میں ہم بادل کی طرح روئے ہیں۔(جس طرح بادل برس کر ہلکا ہو جاتا ہے)اور ہمارے دل کا بوجھ کم ہو گیا ہے۔

شعر....8

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیونکر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

وضاحت

ہم عشق کی شدت سے کمزور ہو کر سوکھ گئے اور ایک کانٹے کی طرح ہو گئے۔ ہمارے محبوب نے ہمیں کانٹا سمجھ کر اپنی گلی سے بھی اٹھادیا اور یوں رقیب کا راستہ اور بھی آسان ہو گیا۔اس بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔

شعر....9

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

گل: پھول　**فصلِ گل:** بہار کا موسم　**سوئے دشت:** ویرانی کی طرف، جنگل کی طرف

وضاحت

بہار کا موسم دیدارِ یار کے ساتھ ہی بھلا معلوم ہوتا ہے اور اگر یار کا قرب نصیب نہ ہو تو بہار میں دل زیادہ گھبراتا ہے۔جنون کی کیفیت ہو جاتی ہے۔مومن بہار سے پہلے ہی صحرا کی طرف بھاگنے کا سوچ رہے ہیں تا کہ بہار آئے تو دل نہ دکھے۔

شعر....10

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھا
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

آرسی: آئینہ، شیشہ

وضاحت

آئینہ انسان کو اُس کی اصل حالت دکھا دیتا ہے اور چہرہ انسان کی دلی اور ظاہری دونوں کیفیات کی عکاسی کرتا ہے۔اگر میرا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تو آئینے کا قصور نہیں بلکہ میری اندرونی (دلی) کیفیت کی ترجمانی ہے۔اس میں شیشے کا قصور نہیں۔

شعر....11

ہے چھیڑ، اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں، گدگدی سے ہم

اختلاط: ملنا جلنا

وضاحت

دنیا والے دو دلوں کو ملتے ہوئے
لیے مومن کہتا ہے کہ ہم نے اپنا انداز تبدیل کر
اندازہ ہو محض دوست کی محبت کو کسی طرح بھی

شعر....12

وحشت
منہ ڈھا

بُکا: آہ وزاری　پری چشم

وضاحت

ہم اپنے محبوب کے سامنے آہ و
ہماری دلی کیفیت نہ ظاہر کر دے اور وہ اور

شعر....13

کیا دل
کیوں اپ

بیگانہ: غیر　**آشنا:** جاننے

وضاحت

دوست سے دوری کے سبب ہم
گیا ہے جسے ہم جانتے تک نہیں۔

شعر....14

لے نام
مومن نہ

بدعتی: سنت کو چھوڑ کر نئی اختر

وضاحت

لوگ میرے سامنے میرے دوس
دور تھوڑا ہو گیا تھا۔لوگ ہمارے درمیان دراڑ

وضاحت

دنیا والے دو دلوں کو ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے اور دنیا والوں کا حسد دو دوستوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔ اس لیے مومن کہتا ہے کہ ہم نے اپنا انداز تبدیل کر لیا ہے کہ ہم گدگدی پر ہنسنے کے بدلے رو دیتے ہیں تا کہ لوگوں کو ہماری اصل حالت کا اندازہ ہو۔ محض دوست کی محبت کو کسی طرح بھی داؤ نہیں لگانا چاہتا۔

شعر....12

وحشت ہے عشق، پردہ نشیں میں دم بکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردہ چشم پری سے ہم

بُکا: آہ و زاری　　**پری چشم:** خوبصورت آنکھیں

وضاحت

ہم اپنے محبوب کے سامنے آہ و بکا بھی نہیں کرتے بلکہ چھپ چھپ کے روتے ہیں کہ کہیں ہمارا رونا ہمارے محبوب تک ہماری دلی کیفیت نہ ظاہر کر دے اور وہ اور مغرور نہ ہو جائے۔

شعر....13

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

بیگانہ: غیر　**آشنا:** جاننے والا　　**اجنبی:** غیر، نہ جاننے والا

وضاحت

دوست سے دوری کے سبب ہم اپنے آپ کو اجنبی لگ رہے ہیں اور یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا دل کوئی ایسا اجنبی لے گیا ہے جسے ہم جانتے تک نہیں۔

شعر....14

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

بدعتی: سنت کو چھوڑ کر نئی اختراعیں کرنے والا

وضاحت

لوگ میرے سامنے میرے دوست "آرزو" کا نام لیتے ہیں جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کیونکہ وقتی ناراضی سے میں ان سے دور تھوڑا ہو گیا تھا۔ لوگ ہمارے درمیان دراڑیں ڈالنے کے لیے نئی نئی باتیں کرتے ہیں مگر ان کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

تجزیاتی نوٹ.......غزل نمبر 2

محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں لکھتے ہیں مومن خان مومن اور فضلِ حق خیرآبادی گہرے دوست تھے اور کسی وجہ سے آپس میں ناراضی ہوگئی جس کا مومن خان مومن کو بہت ملال رہتا تھا۔ آخر کار شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کوشش سے یہ ناراضگی دوستی میں بدل گئی۔ زیرِنظر غزل اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے جس میں مومن باقاعدہ اس بات کا اعلان کر رہے ہیں میں نے کسی دوست سے نہ ملنے اور بولنے کا عہد کر رکھا تھا مگر کیا کریں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئے اور وہ عہد توڑنا پڑا' غزل کے اکثر اشعار کم وبیش اسی کہانی کو مختلف انداز میں پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

مومن خان مومن کیونکہ بنیادی طور پر عشقیہ اور طربیہ شاعر ہیں مگر مومن کی شاعری کے بارے میں ایک بات کہی جاتی ہے کہ وہ شعر کے مفہوم میں ایک دو کڑیاں خالی یا تشنہ چھوڑ دیتے ہیں جس سے معانی کی سو فیصد تفہیم نہیں ہو پاتی مگر تھوڑا غور کرنے کے بعد قاری اصل تفہیم تک پہنچ جاتا ہے۔ ادب میں اسے ''تعقیدِ معنوی'' کہا جاتا ہے۔

زیرِنظر غزل میں یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے کہ پہلی خواندگی میں شعر اتنا واضح نہیں ہو پاتا مگر غور کرنے سے مکمل تفہیم ہو جاتی ہے۔

غزل میں مومن نے اپنے دوست سے ناراضی اور جدائی کا ذکر بڑے دکھی انداز میں کیا ہے کہ میں کسی کو ہنستا ہوا نہیں دیکھ سکتا کیونکہ میرے دل سے ہنسی اُس وقت سے نکل گئی ہے جب سے میرا دوست ناراض ہوا ہے۔

غزل میں محبوب سے رنجش اور دوری کے سبب شاعر کی ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اُسے کچھ بھائی نہیں دیتا اور وہ اس فراق کی بنا پر عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

محبوب کی جدائی میں انسان اس قدر پریشان اور دکھی ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بھی بیزار ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ زندگی سے ہی تنگ آ جاتا ہے اور جب انسان اپنے آپ سے بے زار ہو جائے تو نہ اُس کو کسی گلے کا احساس ہوتا ہے اور نہ وہ کسی شکایت کا ازالہ کرتا ہے وہ ہر شکوے کو من وعن تسلیم کر لیتا ہے۔

عاشق کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی نظروں میں رہے۔ اُس کا محبوب ہر وقت اُس کا ذکر کرتا رہے چاہے نفرت ہی سے کیوں نہ کرے اور دشنام ترازی ہی کرتا رہے مگر عاشق کی منشا معشوق کے سامنے اور اُس کے خیال اور دل ودماغ میں رہنا ہی ہوتی ہے اور اگر محبوب عاشق کا خیال دل سے نکال دے اور کوئی بری بات بھی نہ کرے تو یہ عاشق کے لیے سب سے بڑی سزا ہے۔

رونا ایک آفاقی اور فطری عمل ہے اور انسان ہر عمر میں مختلف کیفیات کے باعث روتا ہے اور رونے سے دل کا غبار نکل جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان اپنا کتھارسس کر لیتا ہے مگر مومن نے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے رونے کو بادل اور بارش سے اور محبوب کی مسکراہٹ کو برق (بجلی) سے تشبیہ دی ہے۔

بہار کا موسم اُسی وقت اچھا لگتا ہے جب دل میں بہار آئی ہو اور اگر دل ویران ہو تو بہار بھی اچھی نہیں لگتی۔ مومن بھی زیرِ نظر غزل میں بہار سے بے زاری کا ذکر کر رہے ہیں کیونکہ جس کے دم سے بہار آتی ہے اگر وہ ہی نہ ہو تو بہار کیسی! اور یہی مثال آئینے کی ہے کہ جب دل میں خوشی ہو تو آئینہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے ورنہ آئینہ بھی انسان کو ڈستا ہے اور اپنی شکل بھی اچھی نہیں لگتی۔

عشق میں ہم پلہ ہونے کا جذبہ بھی مومن کی شاعری کا خاصا ہے اگر یہ پری چہرہ لوگ بے وفا ہیں تو ہم ان کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ آخر میں ایک بار پھر مومن نے اپنے نام کے مطلب کو بدعتی کے تضاد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

پوری غزل اداسی اور فراق کی تصویر پیش کرتی ہے۔

پروین شاکر

(1952ء-1994ء)

سیدہ پروین شاکر 24 نومبر 1952ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ 1966ء میں رضویہ گرلز ہائی سکول کراچی سے میٹرک کیا۔ 1971ء میں سرسید گرلز کالج کراچی سے بی اے آنرز کیا۔ پھر جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور اسی جامعہ سے 1980ء میں ایم اے لسانیات کیا۔ اس کے بعد وہ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ چلی گئیں اور وہاں ہارورڈ یونیورسٹی سے 1992ء میں ای پی اے کیا۔

پروین شاکر کے ادبی اور شعری سفر کا آغاز زمانۂ طالب علمی میں سرسید کالج سے ہی ہو چکا تھا۔ 25 سال کی عمر میں (1977ء) ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''خوشبو'' چھپ کر سامنے آیا جس پر ان کو آدم جی ایوارڈ بھی ملا۔ اسی طرح ''صد برگ'' 1980ء میں ''خود کلامی'' 1985ء میں چھپا۔ اس مجموعہ پر بھی ہجرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ آخر میں ''انکار'' 1990ء میں چھپا اور کلیات ''ماہِ تمام'' 1994ء میں چھپا۔ ''کفِ آئینہ'' ان کی موت کے بعد 1996ء میں چھپا۔

پروین شاکر نے عملی زندگی کا آغاز عبداللہ ہارون گرلز کالج سے کیا تھا اور بعدازاں سی ایس ایس میں پاکستان بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ کسٹم کے محکمہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوگئیں۔ انہیں تمغہ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ 26 دسمبر 1994ء میں ایک ٹریفک حادثہ میں جاں بحق ہوگئیں۔

پروین شاکر کی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک دور ''خوشبو'' سے پہلے اور ''خوشبو'' تک کا اور دوسرا دور ''خوشبو'' کے بعد۔ پہلے دور میں پروین شاکر محبت کی شاعرہ کے روپ میں سامنے آئی اور اس محبت میں بے ساختگی اور بانکپن ہے۔ وہ کھلے عام اس کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں اور اس محبت پر اُن کو فخر بھی ہے۔ وہ اپنے بانکپن کو چھپاتی نہیں بلکہ اس کا کھلے بندوں اظہار کرتی ہیں۔

پروین شاکر دورِ جدید کی نمائندہ شاعرہ شمار کی جاتی ہیں۔ شاعری کے دوسرے دور میں پروین شاکر کا اسلوب قدرے تبدیل نظر آتا ہے اور وہ عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شاعری کے اس دور میں اُن میں وہ خود سپردگی نظر نہیں آتی جو پہلے دور کی خصوصیت تھی۔ دوسرے دور کی شاعری بہت پختہ ہے۔ اس میں پروین شاکر نے عورت کی نمائندگی کا پورا حق ادا کیا ہے اور اس کی زندگی کی ناہمواریوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔

اعلیٰ علمی وادبی گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے پروین شاکر کو اردو سے محبت، تعلیم و تربیت اور شرافت ورثے میں ملی تھی جس کا عکس ان کی شخصیت میں پائی جانے والی خوبیوں سے جھلکتا ہے۔

غزل……1

گو بہ گو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو، ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گُزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

1ء میں رضویہ گرلز ہائی سکول کراچی سے میٹرک
سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور اسی جامع
لی گئیں اور وہاں ہارورڈ یونیورسٹی سے 1992ء

کالج سے ہی ہو چکا تھا۔ 25 سال کی عمر میں
دم جی ایوارڈ بھی ملا۔ اسی طرح ''صد برگ''
گیا۔ آخر میں ''انکار'' 1990ء میں چھپا اور
ں چھپا۔
بعدازاں سی ایس ایس میں پاکستان بھر میں
حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ 26 دسمبر

ے پہلے اور ''خوشبو'' تک کا اور دوسرا دور ''خوشبو''
ں بے ساختگی اور بانکپن ہے۔ وہ کھلے عام اس
ں کا کھلے بندوں اظہار کرتی ہیں۔
ے دور میں پروین شاکر کا اسلوب قدرے
ں اُن میں وہ خود سپردگی نظر نہیں آتی جو پہلے
ت کی نمائندگی کا پورا حق ادا کیا ہے اور اس

ردو سے محبت، تعلیم و تربیت اور شرافت

تشریحات

شعر....1

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اُس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کُو بہ کُو: جگہ جگہ، گلی گلی **شناسائی:** مراد، دوستی **پذیرائی:** عزت، احترام، مقبولیت

وضاحت

محبت کو چھپایا نہیں جا سکتا، ہماری محبت کے چرچے بھی گلی گلی پھیل گئے ہیں، ہر فرد کے منہ پر ہماری محبت کا ذکر ہے مگر اس سے بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ میرے محبوب نے بھی (جس کے حوالے سے مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں محبت کا راز فاش ہونے پر برہم نہ ہو جائے) اس کا خیر مقدم کیا ہے جو میرے لیے اطمینان کا باعث ہے۔

شعر....2

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رُسوائی کی

رسوائی: بدنامی، بے عزتی، ندامت

وضاحت

یہ بات سچ ہے کہ ہمارا محبوب ہمیں چھوڑ چکا ہے۔ اُس نے راستہ بدل لیا ہے مگر میرے لیے یہ بات ندامت اور بدنامی کا باعث ہے اور میرے عشق کی توہین ہے۔ اس لیے میں دنیا والوں کے سامنے یہ بات مانتے ہوئے گھبراتی ہوں۔

شعر....3

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

ہرجائی: دل پھینک، ہر ایک سے تعلقات استوار کرنے والا

وضاحت

یہ بات درست ہے کہ میرا محبوب دل پھینک ثابت ہوا ہے اور وہ ہر ایک سے دل لگا لیتا ہے، مگر جیسا بھی ہے میرا تو

محبوب ہے نا۔ایک وصف جو مجھے اُس کا اچھا لگتا ہے، وہ یہ کہ مجھ سے اگر کہیں دور (کسی اور کے پاس) جاتا بھی ہے تو واپس میرے پاس ہی آتا ہے کیونکہ اُس کا اصل ٹھکانہ میرا دل ہی ہے۔اس لیے میں اُس کی چھوٹی چھوٹی خطائیں معاف کر دیتی ہوں۔

شعر....4

تیرا پہلو، ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گُزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

شبِ تنہائی: تنہائی کی رات

وضاحت

عاشق اپنے محبوب کو کبھی رنجیدہ نہیں دیکھ سکتا۔اس لیے اس شعر میں عاشق اپنے محبوب کو ایسی دعا دے رہا ہے جو عاشق کم ہی دیتے ہیں کہ اے محبوب تجھے میری طرح کبھی تنہائی کا منہ نہ دیکھنا پڑے کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ تنہائی کا دکھ کتنا جان لیوا ہوتا ہے۔پروین کہتی ہیں کہ تیری آغوش بھی آباد رہے اور تیرا دل بھی بے شک وہ میری صورت میں نہ ہو، رقیب ہمیشہ عاشق کا دشمن ہوتا ہے مگر یہ عجیب عشق ہے جو رقیب کو بھی برداشت کر رہا ہے۔

شعر....5

اُس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
رُوح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

پیشانی: ماتھا **تاثیر:** اثر

وضاحت

عاشق کے ہر مرض کا علاج اُس کے معشوق کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہی اُس کا مسیحا ہوتا ہے۔اگر محبوب عاشق کی جلتی ہوئی پیشانی پہ محبت بھرا ہاتھ رکھ دے تو اُس کی تاثیر عاشق کی روح تک پہنچ جاتی ہے۔یہی بات پروین شاکر کہہ رہی ہیں۔

شعر....6

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

وضاحت

برسات کی راتیں جذبات کو اور بھی جِلا بخشتی ہیں اور وصل یار کی خواہش اور بھی بڑھ جاتی ہے۔پروین شاکر بھی ایسے ہی جوان جذبوں کا ذکر کر رہی ہیں کہ جب راتوں میں برسات ہوتی ہے تو جسم کے انگ انگ سے محبت کی چنگاریاں پھوٹتی ہیں اور انگڑائیاں جذبوں کو اور بھی جوان کر دیتی ہیں۔

شناسائی کی
پذیرائی کی
: عزت،احترام،مقبولیت

ہیں، ہر فرد کے منہ پر ہماری محبت کا ذکر ہے مگر
یہ ڈر تھا کہ کہیں محبت کا راز فاش ہونے پر برہم

اُس نے
رُسوائی کی

ہے مگر میرے لیے یہ بات ندامت اور بدنامی
ت مانتے ہوئے گھبراتی ہوں۔

پاس آیا
ہرجائی کی

سے دل لگا لیتا ہے، مگر جیسا بھی ہے میرا تو

تجزیاتی نوٹ.....غزل نمبر 1

پروین شاکر جدید شاعری کی نمائندہ تصور کی جاتی ہیں۔ان کی شاعری میں خالص انسانی جذبات واحساسات پائے جاتے ہیں۔وہ بات کو پردے میں چھپا کر کرنے کے بجائے سیدھے سادے اور سچے انداز سے کرنے کے عادی ہیں۔انہیں سچ بولنا آتا ہے،خواہ یہ سچ قدرے تلخ بھی ہو۔عشق ومحبت کے جذبات ہوں یا زندگی کے دیگر تجربات،پروین شاکر انہیں خالصتاً انسانی رویوں پر پرکھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری میں ایک جیتی جاگتی عورت نظر آتی ہے جو عشق ومحبت کے جذبات واحساسات اور اظہار کو چھپا نہیں پاتی اور نہ ہی چھپانا چاہتی ہے۔

پروین کے ہاں محبت میں بے ساختگی اور والہانہ پن پایا جاتا ہے۔وہ محبوب کے لیے ایثار،قربانی اور نیک تمناؤں کا جذبہ رکھتی ہیں۔محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان جسے چاہے اُسے خوش دیکھنا پسند کرتا ہے بلکہ اُس کی خوشی اور رضا کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔پروین شاکر کے یہاں یہ احساسات موجود ہیں۔

زیرِنظر غزل انہی جذبات واحساسات کی عکاس ہے جس میں خالص انسانی رویئے بول رہے ہیں۔جس میں کوئی گلی لپٹی یا علامتی بات نہیں بلکہ جذبات کا والہانہ انداز ہے۔جو رویہ جس کیفیت میں کسی انسان کا ہو سکتا ہے،اس کا برملا اظہار ہے۔

محبت ایک ایسی خوشبو کی مانند ہے جس کو چھپانا ناممکن ہے۔اس لیے اس کا اظہار ہی سب سے بہتر عمل ہے اور اگر کسی سے محبت ہو جائے تو انسان کی زندگی اس کے سپرد ہوتی ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔اگر وہ بے وفا یا ہرجائی ہے تو اس بات کا دکھ عاشق کے لیے موت کا سبب بن جاتا ہے۔اس بات کو مان لینا کہ میرے محبوب نے مجھے چھوڑ دیا ہے یا مجھ سے دوری اختیار کر لی ہے تو اسے تسلیم کر لینا اور اس کا برملا اظہار کرنا بھی کسی مضبوط دل رکھنے والے عاشق کا کام ہے۔کیونکہ ایسی صورت میں انسان جان بوجھ کر بھی انجان بننے کی کوشش کرتا ہے، مگر پروین شاکر ایسے کڑوے سچ کو بھی نہ صرف مان رہی ہیں بلکہ اُس کا باآوازِ بلند اظہار کر رہی ہیں۔یہ پروین کی شاعری کا خاصا ہے۔

محبوب کی بے وفائی اور ہرجائیت کلاسیکی اور جدید شاعری کا سب سے پسندیدہ موضوع ہے۔کم وبیش ہر شاعر نے اس موضوع کو چھیڑا کیونکہ یہ ایک خالص انسانی جذبہ ہے اور عشق میں ہر انسان کو ایسے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر پروین شاکر نے جس طرح محبوب کی بے وفائی اور اُس کے ہرجائی ہونے کا ذکر کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔کیونکہ انہوں نے ہرجائی محبوب کا ایک وصف جو کہ کم ہی عاشقوں کے لیے قابلِ قبول ہوتا ہے، اسے قبول کیا ہے بلکہ ہرجائی محبوب کو ایک مشورہ دیا ہے اور اسے تسلیم

کرنے کا ایک حل بھی نکال لیا ہے۔

کوئی عاشق اپنے محبوب کا پہلو آباد ہونے کی دعا نہیں دیتا کیونکہ یہ عاشق کے بس کا روگ نہیں' بلکہ عاشق تو محبوب کا قرب اپنے ساتھ چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا مگر زیرِ نظر غزل میں پروین شاکر کے ہاں اس تجربے کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں عاشق محبوب کا پہلو آباد ہونے کی دعا مانگ رہا ہے۔ یہ ایک نیا آہنگ اور جدید انداز ہے۔

پروین شاکر کی شاعری میں محبت میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی عورت نظر آتی ہے جو مکمل طور پر خود سپردگی کے عالم میں ہے۔ جو محبت کے تمام تقاضے پورے کرنا چاہتی ہے۔ جو محبوب کے غلط رویوں کو بھی Justify (جائز) کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

پروین شاکر میں جذبات کے اظہار کا حوصلہ ہے اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسیحائی کی تاثیر روح تک جاتی ہوئی محسوس کر سکتی ہے اور برسات کی راتوں میں انگڑائی کی خواہش کو بھی نہیں دباتی بلکہ اُس کا برملا اعلان کر دیتی ہے۔

غزل.....2

تراش کر مرے بازو اُڑان چھوڑ گیا
ہوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا

رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

عجیب شخص تھا، بارش کا رنگ دیکھ کے بھی
کُھلے دریچے پہ اِک پُھول دان چھوڑ گیا

جو بادلوں سے بھی مُجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دُھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

نکل گیا کہیں اَن دیکھے پانیوں کی طرف
زمین کے نام کُھلا بادبان چھوڑ گیا

عقاب کو تھی غرض فاختہ پکڑنے سے
جو گر گئی تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا

نجانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے، سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

تشریحات

شعر....1

تراش کر مرے بازو اُڑان چھوڑ گیا
ہوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا

تراشنا: کاٹنا **اُڑان:** پرواز **برہنہ:** ننگی **واضح:** کھلی

وضاحت

میرا محبوب مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور زمانے کے دکھوں کے حوالے کر گیا۔ جب سے محبوب نے مجھے چھوڑا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی کام کی نہیں ہوں۔ جیسے کسی پرندے کے پر کاٹ لیے جائیں تو وہ بے یار و مددگار ہو جاتا ہے اور اُڑ بھی نہیں پاتا۔ اسی طرح میرا محبوب مجھے دنیا کے دکھوں کی نذر کر کے چلا گیا، میرا سب کچھ چھین کر چلا گیا۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ اور مجھ پر کٹی کو ہوا کے حوالے کر گیا اب میں اُڑنے کے قابل بھی نہیں ہوں سب کے لیے ایک آسان شکار ہوں۔

شعر....2

رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

رفاقت: ساتھ **دھیان:** خیال

وضاحت

کسی کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس سے جینے کا حق بھی لے لیا جائے اور اُسے تن تنہا کر دیا جائے۔ پروین شاکر محبوب پر طنز کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ میرا محبوب چہ جائیکہ میرا ساتھ نبھاتا بلکہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین بھی کھینچ کر لے گیا یعنی مجھے بے یار و مددگار اور بے کار کر گیا۔ محبوب کی جدائی میرے لیے ایسی ہے کہ جیسے کسی نے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی ہو۔

شعر....3

عجیب شخص تھا، بارش کا رنگ دیکھ کے بھی
کُھلے دریچے پہ اِک پُھول دان چھوڑ گیا

وضاحت

دوستی اور محبت کا تقاضا ہے کہ دوست مصیبت اور مشکل وقت میں کام آتے ہیں اور وہ اپنے دوست کو کسی کے سہارے نہیں چھوڑتے، مگر میرا محبوب ایسا مطلبی، وقتی دوستی رکھنے والا اور خود غرض تھا کہ زمانے کے حالات دیکھ کر بھی مجھے تن تنہا چھوڑ گیا۔ جب مجھے اُس کی ضرورت تھی تو مجھے اکیلا ایک ایسے منجدھار میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں میں ڈوبنے کے قریب ہوں۔ محبوب کا مطلبی اور مفاد پرست ہونا مقصود ہے۔

شعر....4

جو بادلوں سے بھی مُجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دُھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

سائبان: سایہ کرنے والا (تنبو کو بھی سائبان کہتے ہیں)

وضاحت

یہ وہی شخص ہے جو مجھے گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا اور زمانے کی تند تیز ہواؤں اور پریشانیوں سے مجھے بچا بچا کے رکھتا تھا۔ مجھ سے بے انتہا محبت کرتا تھا، مگر افسوس کہ وقت اور زمانے نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ اب جب کہ مجھے اُس (محبوب) کی اصل میں ضرورت تھی تو میرا ساتھ چھوڑ کر چلا گیا۔

شعر....5

نکل گیا کہیں اَن دیکھے پانیوں کی طرف
زمین کے نام کھلا بادبان چھوڑ گیا

ان دیکھے پانی: ان دیکھی سرزمین، نیا جہان   **بادبان:** کشتی کو چلانے والا کپڑا

وضاحت

میرا محبوب مجھے تنہا چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف چلا گیا ہے جہاں میں اُس کا پیچھا نہیں کر سکتی اور وہ سارے نشان مٹا گیا ہے۔ میری کشتی کو ایک کھلا بادبان دے گیا۔ اب ہوا جہاں چاہے اس کشتی کو لے جائے۔ میرا اس پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ پانی اور بادبان کے ذکر سے پروین شاکر نے صفت مراۃ النظیر کا استعمال کیا ہے۔

شعر....6

عقاب کو تھی غرض فاختہ پکڑنے سے
جو گر گئی تو یونہی نیم جان چھوڑ گیا

عقاب: باز، شاہین (جو چھوٹے پرندوں کا شکار کرتا ہے)

فاختہ: مٹیالے رنگ کا ایک چھوٹا پرندہ، اسے گُھگی بھی کہتے ہیں   **نیم جاں:** آدھی مری ہوئی

وضاحت

شاہین بعض اوقات چھوٹے پرندوں کا شکار کر کے انہیں اُسی طرح نیم مردہ چھوڑ جاتا ہے۔ شاعرہ نے وہی مثال دی ہے کہ میرے محبوب کو بس مجھے رام کرنا تھا، میری محبت کو جیتنا تھا اور جب میں اُس کے دام میں آ کر اپنا سب کچھ ہار گئی تو مجھے نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

شعر....7

نجانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

آسیب: جہاں بھوت رہتے ہوں

وضاحت

میں وہ بدقسمت ہوں کہ جس کو بھی دل دیا، جس کو اپنا سمجھا، جس کو اس نگری میں آباد کیا وہی بے وفا نکلا اور مجھے داغِ جدائی دے گیا۔ میری محبت کی پہچان کسی نے نہیں کی۔ اب تو ایسے لگتا ہے جیسے میرے دل میں کوئی آسیب بستا ہے کہ جو بھی آتا ہے وہ دور چلا جاتا ہے۔

شعر....8

عقب میں گہرا سمندر ہے، سامنے جنگل
کس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

عقب: مراد، ایک طرف

وضاحت

میرا محبوب اس قدر بے وفا اور خودغرض تھا کہ مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ اب زندگی اتنی مشکل مرحلے پر پہنچ گئی ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف جنگل یعنی ہر طرف مشکلات ہیں۔ دنیا کے ظلم و ستم ہیں، معاشرے کے بندھن ہیں۔ میں نے جس مسیحا پر اعتماد کیا تھا وہی مجھے بیچ منجدھار چھوڑ کر چلا گیا۔

پروین شاکر کی یہ مسلسل غزل ہے اور پوری غزل شاعرہ کی ذہنی کشمکش کی ترجمان ہے۔

تجزیاتی نوٹ......غزل نمبر2

پروین شاکر کی شاعری کے دو عہد ہیں۔ ایک ''خوشبو'' کے چھپنے سے پہلے کا اور دوسرا ''خوشبو'' کے بعد یا دوسرے لفظوں میں 1977ء سے پہلے اور بعد کی شاعری۔ پہلے عہد کی شاعری میں وہ محبت کی شاعرہ ہے جس میں وہ عشق کے جذبات کا کھل کر اظہار کرتی ہے اور محبت کے حقیقی احساسات کی ترجمانی کرتی ہے اور اپنی اسی شاعری اور نظریات پر ان کو فخر ہے۔ دوسرے دور کی شاعری میں سیاسی اور سماجی شعور نظر آتا ہے اور سوچ میں پختگی ہے۔ یہاں پروین شاکر نے عورت کے استحصال اور جبر جیسے موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اس عہد کی شاعری میں وہ عورت کی نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

زیرِنظر غزل میں محبت کی محرومی اور بے دست و پائی کا ذکر ہے۔ یہ محرومی محبت کی دین بھی ہے اور غزل کی روایت بھی کیونکہ محبت اور دکھوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان محرومیوں اور غموں سے دامن چھڑانا ناممکن ہے۔

بے وفائی، محبوب کی لاغرضی اور لاپروائی بھی محبت کرنے والوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے۔ پوری غزل میں اُداسی کی کیفیت ہے اور محبوب کی بے وفائی کی کہانی ہے۔

جب عاشق بے دست و پا ہو جائے اور اس کا محبوب اُس کو منجدھار کے بیچ چھوڑ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا کیونکہ عاشق کی اڑان صرف محبوب تک ہوتی ہے اور جب یہ اڑان بھی ختم ہو جائے تو دوسرے لفظوں میں اُس کے پر کٹ جاتے ہیں اور پھر وہ اس قدر ناکارہ اور بے اختیار ہو جاتا ہے کہ زمانے کے حوادث، معاشرے کے طوفان کے تھپیڑے اس کی رہی سہی حالت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر اُس کو گھر کے در و دیوار بھی برے لگتے ہیں اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے جیسے کوئی کسی کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لے۔ اس کیفیت کو پروین شاکر نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایسی صورتحال میں پھر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید اُس کے محبوب نے اُسے اس لیے چھوڑا ہے کہ زمانے کے طوفان اُس کو تباہ کر دیں۔ ایسی صورت میں انسان نہ تو محبوب کو کوستا ہے اور نہ ہی اُس کے پاس کوئی اور چارہ ہوتا ہے۔ پھر وہ صرف اپنی قسمت کا رونا روتا ہے، اپنے نصیب پر ماتم کرتا ہے۔ یہ سب کچھ عشق کا انعام ہوتا ہے اور ایسا آغاز سے ہی عاشقوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے، خواہ وہ عاشق رانجھا ہو یا مجنوں یا آج کے دور کا عاشق۔

زیرِنظر غزل میں جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ تمام اشعار میں کم و بیش یکساں نظر آتی ہے۔ یہ مسلسل غزل نہیں مگر پوری

غزل کا تاثر ایک ہی ہے۔ پوری غزل بے وفائی اور محرومی کے تاثر سے بھرپور ہے۔

عورت ہر دور میں معاشرتی جبر اور استحصال کا شکار رہی ہے۔ آج اکیسویں صدی کی عورت بھی معاشرتی استحصال سے آزاد نہیں۔ پروین شاکر نے عورت کی نمائندگی کی ہے اور اس کی محرومیوں کو واشگاف الفاظ میں اجاگر کیا ہے۔ پروین شاکر زندگی کی حقیقتوں کو سچے رنگ میں دکھاتی ہے اور سچے جذبات سے اُس کی ترجمانی کرتی ہیں۔

نظمیں

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

پیدائش: 9 نومبر 1877ء سیالکوٹ وفات: 21 اپریل 1938ء لاہور

ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق اور میونخ یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی دوران بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

یورپ سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں ملازمت اختیار کی مگر کچھ عرصہ بعد وکالت کی پریکٹس شروع کر دی۔ 1922ء میں حکومتِ برطانیہ نے سر کا خطاب دیا۔

علامہ کی شاعری جدوجہد اور عملی زندگی کا پیغام لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کو مثالی زندگی اور مثالی کردار اپنانے کا درس دیا۔ ان کی شاعری کا محور جذبۂ خودی ہے۔ وہ مردِ مومن کی شکل میں ہمارے سامنے ایک سچے اور مکمل مسلمان کی تصویر پیش کرتے ہیں اور اُمتِ مسلمہ کو مردِ مومن کی خصوصیات اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق نظموں (شکوہ اور جوابِ شکوہ) میں انہوں نے مسلمانوں کو ان کا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔

علامہ اقبال نے غزلیں بھی لکھیں مگر ان کا اصل میدان نظم گوئی ہے۔ وہ تصورِ پاکستان کے خالق ہیں اور ان کی شاعری نے ہندوستان کے مسلمانوں کو روحانی طور پر مضبوط اور مستحکم کیا ہے۔

ان کی شاعری میں ایک پیغام ہے۔ علامہ اقبال اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرتے ہوئے قوتِ عمل اور آگے بڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ نظریہ خودی اُن کی شاعری کی بنیادی اساس ہے۔ وہ شاہین کو اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہ بلندی پر رہتا ہے اور پستی سے پرہیز کرتا ہے۔ اقبال کا یہی پیغام مسلمان نوجوانوں کے لیے بھی ہے کہ اُن کی سوچ بلند ہونی چاہیے۔ اقبال کی شاعری اُمتِ مسلمہ کے لیے ہے اس لیے ان کو شاعرِ مشرق کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ نیل سے لے کر کاشغر تک ہے۔

اقبال کو صرف شاعر ہونا پسند نہ تھا بلکہ وہ سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر کے اس کے عروقِ مردہ میں نئی روح پھونکنا چاہتے تھے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

خطاب بہ جوانانِ اسلام

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

تمدن آفریں خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا

سماں اَلفَقرُ فَخرِی کا رہا شانِ امارت میں
"بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوے زیبارا"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظّارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اَسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

حکومت کا تو کیا رونا کہ، وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

''غنیؔ! روز سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زلیخا را''

نظم کی وضاحت

اس نظم میں اقبال مسلمانوں کے تابناک ماضی کو پیش کر رہے ہیں اور عصرِ حاضر کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان! تم نے کبھی سوچا ہے کہ تم ایک عظیم قوم کے فرزند ہو۔ تم ایک ایسے ٹوٹے ہوئے ستارے کی مانند ہو جو روشنیوں اور نور سے بھرے ہوئے آسمان کا حصہ تھا یعنی تم ایک ایسی قوم کے چشم و چراغ ہو جس نے دنیا میں اپنا لوہا منوایا اور پوری دنیا میں اسلام کا نام روشن کیا۔ اے نوجوان! تم جب تک یہ سب کچھ نہیں جان پاؤ گے تو بلندیوں کو نہیں چھو سکو گے۔

اے نوجوان! تیری رگوں میں ان بزرگوں کا خون ہے اور تو ان عظیم اور دلیر لوگوں کی نسل میں سے ہو جنہیں دنیا ادب کی نگاہوں سے دیکھتی تھی اور ان کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ بڑی سے بڑی ریاست بھی ان کے سامنے جھک جاتی تھی۔ ایران کے بادشاہ دارا جیسے لوگ بھی ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے اور اپنی بقا کی خیرات مانگتے تھے۔

اے مسلمان نوجوان تم اُس قوم کا حصہ ہو جنہوں نے جہالت کے دور میں علم کے خزانے بانٹنے اور لوگوں کو رہنے سہنے اور حکومت کرنے کے طریقے سکھائے اور جاہلوں کو تہذیب یافتہ بنا دیا۔ اونٹ چرانے والے عرب کے بدوؤں کو تہذیب کا پیکر بنا دیا۔

اے نوجوان تو اس قوم کا حصہ ہے جس نے دنیا کو تہذیب سکھائی جس کے حکمران اپنی فقیری پر فخر کرتے ہیں۔ جس کے فکر کے سامنے تاجور سر جھکاتے تھے۔ جس کی سادگی میں اتنی شان تھی کہ بادشاہوں کی آنکھیں جھک جاتی تھیں۔ اس لیے تمہیں سوچنا ہوگا کہ تم نے اس دنیا کو تسخیر کرنے کے لیے کیا کرنا ہے؟

اے نوجوان تیرے آباؤ اجداد نے صرف اللہ پر بھروسہ کیا۔ کسی کے مال و دولت سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے دولت مند ان کے سامنے آ کر تہذیب و تمدن اور علم کی بھیک مانگتے تھے۔ اگر کوئی غریب تھا تو اتنا غیرت مند کہ کوئی امیر انہیں خیرات دیتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ اے نوجوان یہی خوبیاں تمہیں بھی اپنے اندر پیدا کرنی ہوں گی۔

اقبال کہتے ہیں کہ میں ان بزرگوں کی کیا تعریف کروں اصل میں وہی لوگ تھے جو صحراؤں میں رہنے کے باوجود دنیا والوں کو بادشاہت کے گر بتاتے تھے۔ تمدن سکھاتے تھے۔ وہی اصل میں بادشاہ ہیں انہوں نے اپنے علم اور دانائی کی بدولت اس دنیا کو فتح کیا۔

اے نوجوان میں اگر چاہوں تو تمہارے آباؤ اجداد کی عظمت اور عزت کی پوری تصویر تمہیں دکھا دوں مگر مجھے یقین ہے

کہ تیری سوچ ابھی تک اُس مقام پر نہیں پہنچ پائی کہ تم اُن کے مقام و مرتبے کو سمجھ سکو۔ اقبال اصل میں نو جوانوں کو غیرت دلا رہے ہیں کہ وہ جاگ جائیں اور اپنے اجداد کے نقشِ قدم پر چل نکلیں۔ پھر اقبال نو جوانوں کو جوش دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم اپنے آباؤاجداد کے قدموں کی خاک ہو۔ تمھیں اُن سے نسبت دینا یا تمہارا ان سے موازنہ کرنا بالکل ممکن نہیں کیونکہ تم صرف باتیں بناتے ہو وہ عمل کرتے تھے۔ تم نام کے مسلمان ہوں وہ کردار سے ثابت کرتے تھے اس لیے تمھیں ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا اُس منزل تک جانے کے لیے۔

بلکہ آج کے نو جوان نے تو اپنے اسلاف کے کارناموں کو بھی بٹا لگا دیا ہے اور ان کی شان وشوکت کم کرنے کا باعث بنا ہے۔ جو عزت تمھیں وراثت میں ملی تھی وہ بھی تم نے گنوادی ہے اس لیے آسمان سے گر کر زمین پر آ رہے ہو۔

دنیا والوں نے تیرے اسلاف سے سب کچھ سیکھا مگر آج کا مسلمان رسوا ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت اور بادشاہت جو ایک عارضی شے ہے وہ تو درکنار تم لوگوں نے اپنے کردار اور پہچان کو بھی داغدار بنا ڈالا ہے۔

اور ہمارے بزرگوں کے علم سے پورے یورپ نے فیض حاصل کیا اور آج بھی ہمارے اجداد کے علمی نسخے یورپ والوں کے لیے سرچشمہ ہدایت بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

اقبال آخری شعر (جو فارسی شاعر غنی کاشمیری کا ہے) میں اس بات کی وضاحت کرتے ہیں: ترجمہ (حضرت یعقوبؑ کی بدقسمتی تھی کہ ان کی آنکھ کا نور (بیٹا) زلیخاں کی آنکھوں کا نور بن گیا) یعنی مسلمانوں کے علم کے خزانوں سے دوسری اقوام فائدے حاصل کر رہی ہیں اور ہم وہیں کے وہیں ہیں بلکہ اُس سے بھی بدتر۔

تجزیاتی نوٹ....."خطاب بہ جوانانِ اسلام"

علامہ اقبال کی شاعری کو چارادوار میں تقسیم کیا جا تا ہےاور ہر دور کی شاعری میں ہمیں ایک نیا اقبال نظر آ تا ہے۔ اقبال نے بھی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور شروع میں روایتی غزل لکھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی فکر اور نظریات میں تبدیلی آئی جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی ہوا اور اس طرح علامہ اقبال ایک نظریاتی شاعر اور فلسفی کے روپ میں سامنے آئے۔

اقبال نے "لفظ برائے شعر گفتن خواب است" کی بنیاد پر شاعری نہیں کی بلکہ اپنی شاعری میں ایک پیغام اور فلسفہ حیات دیا۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو عمل کا پیغام دیا۔

اقبال کاہلی کو ناپسند کرتے ہیں اور عمل کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی حرکت کرنے اور آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے لیے وہ ایک مثالی نوجوان کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ اس نوجوان کو کبھی "شاہین" اور کبھی "مردِمومن" کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو قوتِ عمل سے لبریز ہے جس کا ایمان مضبوط ہے جو اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور کسی کا مرہون نہیں ہوتا۔

زیرِنظر نظم میں اقبال مسلمان نوجوانوں سے مخاطب ہو کر انہیں ان کی اصل پہچان بتا رہے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان تو کس نسل سے تعلق رکھتا ہے تیرے اسلاف کس قدر عظیم اور بلند مرتبہ تھے۔ تیرے اسلاف نے پوری دنیا میں اپنے آپ کو منوایا اور دارا جیسے بادشاہوں کا غرور خاک میں ملا دیا۔ اے مسلمان نوجوان تجھ میں وہی خون ہے اور تیرے اندر وہی طاقت اور جذبہ پیدا ہوسکتا ہے جو تیرے بزرگوں میں تھا۔ بس اپنے سوچ کے محور کو بلند رکھنا ہے اپنی غیرت کو جگا کے رکھنا ہے اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہے کسی کے سہارے زندگی گزارنا غیرت مند اور دلیر انسان کا شیوہ نہیں۔

اقبال عرب کی سرزمین کے حوالے سے بتاتے ہیں وہ عربی لوگ جو صرف اونٹ چرانا جانتے تھے۔ جب اسلام کی روشنی سے فیض یاب ہوئے تو تمدن کی وہ مثال قائم کی کہ لوگ انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ صحرا میں بسنے والوں نے ایسا خوبصورت معاشرہ تخلیق کیا کہ اخوت، مساوات اور بھائی چارے کی مثالیں قائم کردیں۔

اصل میں اقبال مسلمان نوجوانوں کو ان کا تابناک ماضی دکھا کر اُسے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان ایک عظیم قوم ہے اور آج کے نوجوانوں کو اپنی پہچان ہونی چاہیے اور اپنی پہچان اس وقت ہوگی جب وہ گفتار اور کردار میں لوگوں کے لیے مثال بن جائیں گے۔

اقبال نوجوانوں کو درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کی پیروی زمانہ کرتا تھا وہ اصل میں تھے کیا؟ اور وہ زندگی کیسے گزارتے تھے؟ انھوں نے دنیا میں جو مقام حاصل کیا تو اُس کے پیچھے کیا محرکات تھے؟

اقبال نوجوانوں کو ان بزرگوں کی مثال دے رہے ہیں جو حکمران کے ہوتے ہوئے بھی فقر (فقیری) میں رہتے تھے اور اپنی دولت کا غرور کرنے کے بجائے خاکساری سے کام لیتے تھے کیونکہ اللہ کو عجز پسند ہے اور عاجزی ہی سب سے بڑی امارت ہے۔

آج کا نوجوان اُس منزل تک نہیں پہنچ پاتا' نہ تو اُس میں عمل کی قوت ہے اور نہ ایمان کا جذبہ ہے۔ آج کا نوجوان صرف نعرہ بازی اور ''پدرم سلطان بود'' کے سہارے پر زندگی گزار رہا ہے۔ اقبال بلند آواز سے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اپنے اسلام کی میراث کھودی ہے اس لیے ہم عرش سے فرش پر آ گرے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کو نہ بادشاہی کا لالچ تھا اور نہ حکومت کا بلکہ وہ تو صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیتے تھے۔ اقبال اس بات پر رنجیدہ ہیں کہ ہمارے اسلاف کے علمی فن پاروں سے اہلِ یورپ فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہم جہالت کے اندھے کنویں میں گرے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے اقبال نے حضرتِ یعقوب اور جناب زلیخا کا ذکر کر کے صنعتِ تلمیح کا بڑا خوبصورت استعمال کیا ہے۔

فرہنگ.... خطاب بہ نوجوانِ اسلام

تدبر: سوچنا، تدبیر کرنا

آغوش: گود، گہوارہ

تمدن آفریں: رہنے کا سلیقہ بنانے والے لوگ، تمدن کی تعلیم دینے والے

شتربان: اونٹ چرانے والے

الفقر فخری: مجھے اپنے فقر، فقیری، سادگی پر ناز ہے (حدیث ہے)

"آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا": خوبصورت چہرے کو سجانے کی ضرورت نہیں

گدائی: غربت، کمزوری

منعم: دولت مند

صحرا نشین: ریگستان میں رہنے والے

جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان

و جہاں آرا: دنیا کو فتح کرنے والے، تہذیب سکھانے والے اور دنیا کو سجانے اور سنوارنے والے

تخیل: خیال، سوچ

گفتار: باتیں

ثابت: رکا ہوا، بے کار

میراث: ورثے میں ملنے والی چیز

سیپارہ: 30 ٹکڑے، ٹکڑے ٹکڑے

تاجِ سرِ دارا: ایران کے بادشاہ دارا کا تاج

خلاقِ آئینِ جہاں داری: حکومت کے دستور بنانے والی قوم

گہوارا: پنگھوڑا، پالنا

شانِ امارت: امیری کی شان

غیور: غیرت مند

فزوں تر: اونچا، بلند

آباء: اباؤ اجداد

سیارہ: چلنے پھرنے والا، حرکت کرنے والا

ثریا: بلندی، اونچائی

آئینِ مسلم: پختہ قانون

"غنی روز سیاہِ پیر کنعاں را تماشہ کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را"

ترجمہ: اے غنی کنعان کے بوڑھے (حضرت یعقوبؑ) کی بدقسمتی دیکھیے کہ ان کی آنکھوں کا نور (بیٹا یوسفؑ) جا کر زلیخاں کی آنکھوں کا نور بن گیا۔

مراد: مسلمانوں کی کارناموں سے یورپ والے فیض یاب ہوئے۔

مولانا الطاف حسین حالؔی

(1837ء.....1914ء)

مولانا الطاف حسین حالی 1837ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ حالی کی عمر ابھی نو سال کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی امداد حسین نے پرورش کی ذمہ داری لی۔ حالی نے عربی اور فارسی کی تعلیم کے ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کیا۔ سترہ برس کی عمر میں مرضی کے خلاف شادی کر دی گئی اور حالی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دلّی چلے گئے اور عربی صرف ونحو، منطق کی تعلیم حاصل کی۔ 1856ء میں حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور ایک سال بعد پانی پت چلے گئے اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بچوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ آٹھ سال بعد دلّی آ کر غالب کے شاگرد ہو گئے۔ اب تک حالی شاعری میں بھی پختگی اختیار کر چکے تھے اور نثر میں بھی۔

غالب کی وفات کے بعد حالی لاہور آ گئے اور گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ لاہور میں قیام کے دوران مولانا آزاد کے ساتھ مل کر جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور جدید طرز پر نظم خوانی پر مبنی مشاعروں کا آغاز کیا۔ لاہور میں قیام کے دوران اینچیسن کالج میں بھی تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔ لاہور میں چار سال رہنے کے بعد واپس پانی پت چلے گئے اور اینگلو عربک کالج میں معلم کی حیثیت سے کام کیا پھر پانی پت میں ہی مستقل سکونت اختیار کی۔ اس دوران سرسید سے بھی ملاقات ہوئی اور مسدس ''مد وجزر اسلام'' بھی اسی زمانے میں لکھی۔ 31 دسمبر 1914ء میں پانی پت میں ہی حالی کا انتقال ہوا۔

حالی سرسید سے بہت متاثر تھے۔ سرسید کے ساتھ مل کر ان کی تحریک (تحریکِ علی گڑھ) کے لیے بھی کام کیا اور سرسید کے کہنے پر ہی مسدس لکھی جو بعد میں حالی کی پہچان بن گئی۔ حالی نے اپنی شاعری کے ذریعے اسلام کے روشن دور کو جدید انداز میں پیش کیا اور مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے آگاہ کیا تا کہ جدید دور کا مسلمان اپنے اندر وہی خوبیاں پیدا کرے جس کی بدولت مسلمانوں نے دنیا میں اپنی پہچان کرائی تھی۔

سرسید کی اصلاحی تحریک کے باعث حالی نے شاعری میں بھی اصلاح کا پہلو شامل کیا جسے ''نیچرل شاعری'' کا نام دیا گیا۔ حالی نے شاعری کو زلف ورخسار سے نکال کر زمانی ضروریات، دیگر انسانی احساسات و جذبات کا آئینہ دار بنایا۔ بعد میں جب ترقی پسند ادب کی بنیاد پڑی اور ترقی پسندوں نے اس چیز سے خوب فائدہ اٹھایا۔

حالی نے شاعری سے قدیم اور گھسے پٹے موضوعات نکال کر قومی اور اخلاقی موضوعات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ مسدس اس کی زندہ مثال ہے۔ حالی نے صرف نظم کی ہی نہیں بلکہ غزل کی بھی اصلاح کی اور اصلاحی شاعری کے حوالے سے ایک طویل مقدمہ لکھا جو ایک کتاب کی شکل میں ''مقدمہ شعروشاعری'' کے نام سے شائع ہوا۔

مسدسِ حالی

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں
کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں
امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتیِ دین و ملت کو تھامے

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل
زمانے میں ہو منہ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل
خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی اپنی مدد وہ

کرو قدر ان کی ہنر جن میں پاؤ
ترقی کی اور ان کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے ان کے مل کر بڑھاؤ
ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انہیں سر پہ اپنے پرائے

کرو گے اگر ایسے لوگوں کی عزت
تو پاؤ گے اپنے میں تم اِک جماعت
بڑھائے گی جو قوم کی شان و شوکت
گھرانوں میں پھیلائے گی خیر و برکت
مدد جس قدر تم سے وہ آج لے گی
عوض تم کو کل اس کا دہ چند دے گی

ترقی کے یوناں کے اسباب کیا تھے
ہنر پر جہاں پیر و برنا فدا تھے
تمدن کے میداں میں زور آزما تھے
وطن کی محبت میں یکسر فنا تھے
مقاصد بڑے اور ارادے تھے عالی
نہ تھا اس سے چھوٹا بڑا کوئی خالی

سبب کچھ نہ تھا اس کا جز قدردانی
کہ ہوتے تھے جو علم و حکمت کے بانی
ترقی میں کرتے تھے جو جاں فشانی
حیات ان کو ملتی تھی واں جاودانی
وطن جیتے جی ان پہ قرباں تھا سارا
پس از مرگ پجتے تھے وہ آشکارا

اِسی گُر نے تھا جوش سب کو دلایا
کہ تھا اِک جزیرہ نے رُتبہ یہ پایا
اِسی شوق نے تھا دلوں کو بڑھایا
اِسی نے تھا یوناں کو یوناں بنایا
اس امید پر کوششیں تھیں یہ ساری
کہ ہو قوم کے دل میں عظمت ہماری

جنہیں ملک میں اپنی رکھنی ہو وقعت
جنہیں سلطنت کی ہو مطلوب قربت
جنہیں تھامنی ہو گھرانے کی عزت
جنہیں دین کی ہو نہ منظور ذلت
جنہیں نسل و اولاد ہو اپنی پیاری
انہیں فرض ہے قوم کی غمگساری

بہت دل ہیں نرم ان دنوں ہوتے جاتے
کہ حالت پہ ہیں قوم کی اڈے آتے
تنزّل پہ ہیں اس کے آنسو بہاتے
نہیں آپ کچھ کرکے لیکن دکھاتے
خبر بھی ہے دل ان کے جلتے ہیں کس پر
وہ ہیں آپ، ہی ہات ملتے ہیں جس پر

رئیسوں کی جاگیرداروں کی دولت
فقیہوں کی دانشوروں کی فضیلت
بزرگوں کی اور واعظوں کی نصیحت
ادیبوں کی اور شاعروں کی فصاحت
جچے تب کچھ آنکھوں میں اہل وطن کی
جو کام آئے بہبود میں انجمن کی

نظم کی وضاحت

ہمارے نصاب میں شامل بند مسدسِ حالی سے اقتباس ہیں اور یہ نظم کا وہ حصہ ہے جہاں حالی تعلیم کی اشاعت، قوم کی غمگساری اور قومی مسائل کے علاوہ اپنی قوم کا یونان اور یونانی قوم سے موازنہ کر رہے ہیں۔

حالی کہتے ہیں کہ تعلیم کو ایسے عام کر دو کہ مسلمانوں کی نسلیں سنور جائیں کیونکہ حالی یہ سمجھتے تھے کہ قوم کی تعمیر اور ترقی کا راز تعلیم میں ہی ہے۔ انہوں نے اس بات کا برملا اظہار کیا ہے کہ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب تعلیم سب کے لیے ضرورت ہے۔ تعلیم کے بغیر انسان اور حیوان ایک جیسے ہیں اور اگر مسلمان تعلیم حاصل کر جائیں گے تو ہی یہ اپنی ملت کی کشتی کو تھامنے کے قابل ہوں گے اور اگر مذہب کی خدمت کا جذبہ ہے تو وہ بھی تعلیم ہی سے ممکن ہے۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد قومیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور خود مختار ہونے کے قابل بنتی ہیں اور تعلیم یافتہ قوم ہی زمانے میں دوسری قوموں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا وجود منوا سکتی ہے۔ تہذیب و تمدن بھی تعلیم کے مرہونِ منت ہے اور انسان انسانیت کے رتبے پر بھی تعلیم ہی کی بدولت فائز ہو سکتا ہے۔ تب جا کر اُسے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیا اُس کے لیے اچھا ہے اور کیا برا۔

حالی ہنر مندی کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں کہ معاشرے میں وہ لوگ باعزت زندگی گزارتے ہیں جو ہنر مند ہوں۔ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے عزت کا باعث بنتے ہیں اور وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ لوگوں کو ہنر مندی کی رغبت دلاؤ ان میں اس بات کا شوق پیدا کرو۔ اگر قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ اور ہنر مند ہوں گے تو وہ بذاتِ خود بھی اور قوم کے لیے بھی عزت و افتخار کا باعث بنیں گے۔

پھر حالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہنر مند اور تعلیم یافتہ لوگوں کی عزت کرو۔ اُن کی حوصلہ افزائی کرو کیونکہ ان کے دم سے ہی قوم کی گاڑی کا پہیہ چلتا ہے۔ آج اگر تم قومی خدمت کا جذبہ رکھو گے تو کل پھر تم خود ہی اُس قوم کی عزت کا حصہ بن پاؤ گے۔

حالی کہتے ہیں کہ ماضی میں اگر مسلمانوں نے دنیا میں عزت حاصل کی، نام کمایا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ہنر مندی بھی تھی وہ جدید علوم اور فنون سے واقف تھے۔ پھر حالی یونانی قوم کا ذکر کرتے ہیں کہ یونانیوں نے اگر دنیا میں نام کمایا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ علوم و فنون میں سب سے آگے تھے۔ آج بھی اگر قوم نے عزت

حاصل کرتی ہے تو فنون سیکھے۔

آگے چل کر حالی قوم کی غمگساری کا ذکر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اتحاد اتفاق اور یگانگت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کے غم اور دکھ میں شریک ہونا چاہیے۔ افراد کا مسئلہ قومی اور انفرادی حد تک محسوس کیا جانا چاہیے۔ اگر مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر اور ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں جھکا نہیں سکتی۔

حالی ایک قومی مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہم لوگ برائے نام مذہب اور قوم کا پرچار کرتے ہیں۔ بظاہر ہم قوم کے غم میں آنسو بھی بہاتے ہیں مگر کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ ہم میں موجود نہیں ہے۔ ہم عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ بس نعرہ بازی سے کام لیتے ہیں۔ (یہی حال آج بھی ہماری قوم اور ملک کا ہے) حالی اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم برائے نام قوم کا درد محسوس کرتے ہیں مگر اصل میں ہم کاہل اور لاپرواہیں اور اس بند میں قومی جذبے پر زور دیا گیا ہے۔

حالی کہتے ہیں کہ ہمارے شاعر، ادیب، رئیس، جاگیردار، دولت مند، دانش ور یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر خدمت کر رہے ہیں مگر حالی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان سب کی خدمات قوم کے لیے ہونی چاہیے سب کو قومی دھارے میں شامل ہونا چاہیے۔ سب مل کر قوم کی خدمت کریں اور قومی مسائل کا حل تلاش کریں۔ ورنہ انفرادی طور پر ان کی خدمت رائیگان جائے گی۔

تجزیاتی نوٹ......''مسدسِ حالی''

خواجہ الطاف حسین حالی سرسید تحریک کے روحِ رواں تھے اور سرسید کے ان چار ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے علیگڑھ کی علمی ادبی تحریک کے لیے کام کیا۔ اس تحریک میں پہلی بار ادب میں اصلاح کا پہلو شامل کیا گیا اور اردو شاعری محبوب کی زلفوں سے قدرے آزاد ہو کر زندگی کے دوسرے معاملات کو بھی اپنا موضوع بنانے لگی۔

حالؔی نے شاعری میں اصلاحی نقطۂ نظر کو اس قدر اہمیت دی کہ اس پر اتنا طویل مقدمہ لکھا جو بعد میں مقدمہ شعر و شاعری کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں چھپ گیا۔ حالؔی نے محمد حسین آزؔاد کے ساتھ مل کر غزل کے بجائے نظم کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور نظم کے میدان میں بے شمار نئے تجزیات کیے۔

مولانا حالی نے سرسید کے کہنے پر مسلمانوں کے تابناک ماضی پر ایک طویل مسدس لکھی جس کا نام ''مسدس مدو جزرِ اسلام'' رکھا جو بعد میں مسدسِ حالی کے نام سے مشہور ہوئی۔ زیرِ نظر نظم کے بند اسی مسدس سے اقتباس ہیں۔ یہ مسدس اس قدر مشہور ہوئی کہ سرسید نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خدا مجھ سے پوچھے کہ تم نے دنیا میں کیا بڑا کام کیا تو میں کہوں گا کہ میں نے حالی سے مسدس لکھوائی۔

یہ نظم جس طرح اس کے نام سے ہی ظاہر ہے مسلمانوں کی عروج و زوال کی کہانی ہے۔ الطاف حسین حالی نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اُمت مسلمہ پر عروج تھا تو کس وجہ سے تھا اور اگر زوال آیا تو اس کے محرکات کیا تھے۔

حالی عروج کی وجہ یہ بتاتے ہیں ہمارے اسلاف کے کارناموں کی وجہ سے تھا۔ وہ لوگ کردار، گفتار اور عمل سے سچے مسلمان تھے اور اپنے آپ کو اسلام کی اصل روح کے مطابق ڈھالا ہوا تھا' اس لیے دنیا ان کی قدر کرتی تھی اور وہ دوسری اقوام کے لیے ایک نمونہ تھے۔ ان کا کردار بھی قابلِ رشک تھا اور عمل بھی۔

زیرِ نظر اقتباس میں حالی تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر دنیا میں ترقی کرنی ہے یا دوسری اقوام کا مقابلہ کرنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا اس کے بغیر چارہ نہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تعلیم ہر امیر غریب کے لیے ضروری ہے۔ تعلیم کی وجہ سے ہی قوموں کی پہچان ہوتی ہے اور تعلیم ہی واحد ترقی کا ذریعہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ حالی ہنر سیکھنے کا بھی مشورہ دیتے نظر آتے ہیں کیونکہ حالی جانتے تھے کہ آنے والے زمانے میں ہنرمند افراد ہی معاشرے کے کارآمد شہری ثابت ہو سکتے ہیں۔ بے ہنر اور جاہل لوگ معاشرے اور قوم پر بوجھ ہوتے ہیں۔ حالی

راہِ ترقی: ترقی کا راستہ
کشتیِ دین وملت: مذہب او
تمدن: تہذیب، رہن سہن
آدمیت: انسانیت
ستون: مینار
دوچند: بہت زیادہ
پیروبرنا: چھوٹے بڑے، بوڑ
حیاتِ جاودانی: ہمیشہ رہنے
یکسر: مکمل طور پر
قدردانی: عزت
جاں فشانی: محنت کرنا
پجتے تھے: پوجے جاتے تھے
گُر: داؤ، طریقہ، انداز
مطلوب: چاہا جانے والا، مقص
وقعت: اہمیت
سلطنت: ملک
تھامنا: پکڑنا، ذمہ داری لینا
ذلت: بے عزتی
غمگساری: غم بانٹنا، غم خواری
دل جلنا: گوارہ نہ ہونا، ناگوار گز

ہنر مند لوگوں کی عزت افزائی کر رہے ہیں اس کے لیے وہ ترقی یافتہ اور ہنر منداقوام کی مثالیں بھی دیتے ہیں۔

یونان زمانۂ قدیم سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور یونانی قوم دوسری اقوام کے لیے قابلِ رشک رہی ہے۔ حالی بتاتے ہیں کہ یونان کی ترقی کی وجہ بھی تعلیم ہی تھی اور وہ سب لوگ ہنر مندی میں اپنی مثال آپ تھے۔ حالی کہتے ہیں کہ یونان نے اگر دنیا میں اپنا لوہا منوایا تو اُس کی وجہ یونانی قوم کی علم سے رغبت اور ہنر سے پیار تھا۔

جب تک کسی قوم میں اتحاد، یگانگت اور اپنی ملت سے پیار اور اس کا درد نہ ہو وہ قوم زمانے میں ترقی نہیں کر سکتی۔ حالی کے دل میں قوم کے زوال اور تنزل کا دکھ ہے اور وہ برصغیر کے مسلمانوں کو ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے وہ ہم سے بھی یہی توقع کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں قومی جذبہ کارفرما ہو، قوم کے غم میں خالی آنسو بہانے سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے کچھ کرنا ہوگا۔ عمل کر کے دکھانا ہوگا اور اگر معاشرے کے تمام طبقات کے لوگ اس میں حصہ نہیں ڈالیں گے تو قوم ترقی نہیں کر پائے گی۔

حالی کی یہ نظم سرسید تحریک کے بنیادی اصولوں کی عکاس ہے۔ سرسید کے زیر اثر حالی نے جہاں مقصدی شاعری کی، وہاں وہ اردو ادب کی خدمت بھی کر گئے اور شاعری کو ایک نیا میدان عطا کر گئے۔

فرہنگ....مسدسِ حالی

راہِ ترقی: ترقی کا راستہ

کشتیِ دین وملت: مذہب اور اقوام کا بیڑا

تمدن: تہذیب، رہن سہن

آدمیت: انسانیت

ستون: مینار

دوچند: بہت زیادہ

پیروبرنا: چھوٹے بڑے، بوڑھے اور جوان

حیاتِ جاودانی: ہمیشہ رہنے والی زندگی

یکسر: مکمل طور پر

قدردانی: عزت

جاں فشانی: محنت کرنا

پجتے تھے: پوجے جاتے تھے

گُر: داؤ، طریقہ، انداز

مطلوب: چاہا جانے والا، مقصد

وقعت: اہمیت

سلطنت: ملک

تھامنا: پکڑنا، ذمہ داری لینا

ذلت: بے عزتی

غمگساری: غم بانٹنا، غم خواری

دل جلنا: گوارہ نہ ہوا، ناگوار گزرنا

فقیہوں: دینی مسائل سے واقف لوگ، علما

بہبود: بھلائی، بہتری

نورِ تعلیم: تعلیم کی روشنی

تاباں: چمکنا

منہ دکھانا: روبرو ہونا، سامنے آنا

خطاب: وہ نام جو حکومت کی جانب سے ملتا ہے

نیک وبد کو سمجھنا: اچھے اور برے کی پہچان

رغبت دلانا: شوق پیدا کرنا، جذبہ پیدا کرنا

سر پر بٹھانا: عزت دینا

یونان: یورپ کا ایک قدیم ملک، شروع سے ہی علم وہنر کا مرکز رہا ہے

ازمرگ: مرنے کے بعد

آشکارا: کھلنا، واضح ہونا

قربت: قریب ہونا، پالینا

تنزل: زوال، پستی، گراوٹ

ہاتھ ملنا: افسوس کرنا، پچھتانا

آنکھوں میں جچنا: آنکھوں کو بھلا لگنا، اچھا لگنا

انجمن: محفل، مراد قوم

واعظ: نصیحت کرنے والا

فضیلت: بڑائی

فصاحت: تعلیم، سمجھانا، بتانا

حفیظ جالندھری

(1900ء....وفات:1983ء)

حفیظ 1900ء میں جالندھر میں پیدا ہوئے۔ پورا نام محمد حفیظ تھا، جالندھری ''جالندھر'' میں پیدا ہونے کی وجہ سے کہلوائے۔ ''حفیظ''، تخلص اور ''ابوالاثر'' کنیت تھی۔ حفیظ نے ابتدائی تعلیم جالندھر سے ہی حاصل کی۔ فکرِ معاش کی بدولت تعلیم مکمل نہ کر پائے۔ حفیظ مختلف صحافتی اداروں سے منسلک رہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران حفیظ ''پبلسٹی آرگنائزیشن'' کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے۔ حفیظ کو شعروسخن کا شوق ابتدا ہی سے تھا اور وہ مختلف محافل اور مشاعروں میں بڑے شوق سے شرکت کیا کرتے تھے۔

حفیظ جالندھری نے دیہی امدادی ترقی، ادارۂ تعمیرِنو اور افواجِ پاکستان میں ڈائریکٹر آف مورال (اخلاقیات) کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ حفیظ نے 83 سال کی طویل عمر پائی اور ان کا انتقال 1983ء میں ہوا۔

حفیظ کی شاعری میں گیت نگاری اور ان کی اسلام دوستی کا عمل دخل ہے۔ اسلامی شعائر اور اسلامی تعلیمات کو وہ اپنی شاعری میں خاص مقام دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ''شاہنامۂ اسلام'' کو ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے نصاب میں شامل ان کی نظم ''انسانِ کامل کی برکات'' بھی ان کی اسلامی شعائر سے لگن اور محبت کی زندہ مثال ہے۔ اس نظم کا مرکزی خیال آنحضرتؐ کی ذاتِ پاک اور ان کے دم سے ہونے والی برکات اور نوازشات پر مبنی ہے۔

حفیظ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اور لطیف جذبات اور شگفتہ خیالات ان کی شاعری کا زیور ہیں۔ وہ الفاظ اور خیالات کی خوبصورتی سے شاعری کو دلکش بناتے ہیں۔ حفیظ کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے قومی ترانے کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر کے قومی ترانے کا خالق ہونا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے ترانے کی دھن (طرز) پہلے بن چکی تھی اور شاعری بعد میں تخلیق ہوئی۔ یہ چیز بھی حفیظ کے کمالِ فن کی مثال ہے۔

انسانِ کامل کی برکات

یہاں روح الامیںؑ، خیر الامیںؐ کے در پہ حاضر تھا
یہاں رحمت تھی سرگرمِ عمل، اللہ ناظر تھا

نمایاں ہو رہے تھے روز و شب انسان کے جوہر
کمال بندگی کے، علم کے، عرفان کے جوہر

جبینیں تھیں یہاں انوارِ ایمانی سے تابندہ
نگاہیں تھیں یہاں الطافِ ربانی کی جوئندہ

نہ رعبِ بادشاہی تھا، نہ فخرِ تاجداری تھی
محمد ﷺ کی قیادت میں خدا کی شرع جاری تھی

نہ شانیں تھیں دکھاوے کی نہ پوشاکیں نمائش کی
نہ تمہیدیں تفاخر کی، نہ ترکیبیں ستائش کی

کمر باندھے ہوئے سرکارِ حریت کے درباری
مسلسل کر رہے تھے آج چشمے فیض کے جاری

یہاں بے زر نئی دنیا کی تعمیریں اٹھاتے تھے
مساواتِ بنی آدم کے نظارے دکھاتے تھے

تمنائیں بر آتی تھیں یہاں ذوق ارادت کی
صداقت کے لیے دولت مہیا تھی شہادت کی

یہاں ہر رنگ کے پھولوں کا اک گلزار کھلتا تھا
غریبوں بے زبانوں کو لبِ گفتار ملتا تھا

یہاں مٹی نے سیکھا مطلع الانوار ہو جانا
نصیبے کو جگانا، دولتِ بیدار ہو جانا

یہاں تسکین وراحت پائی تھی آفت کے ماروں نے
یہاں سیکھا خوشی سے مسکرانا سوگواروں نے

یہاں پسماندگی نے درس پایا شہسواری کا
یہاں حاصل تھا محکوموں کو رتبہ شہریاری کا

یہاں دولت سے رغبت تھی نہ غربت سے تھی بیزاری
کہ دولت مند کا تھا رشکِ استغنائے ناداری

یہاں بندے تھے قائم حق پرستی، حق پسندی پر
لیے جاتا تھا ذوقِ انکسار ان کو بلندی پر

مجاہد تھے مگر نامِ خدا پر کانپ جاتے تھے
یہ زاہد تھے فقط صدق و یقیں پر سر جھکاتے تھے

یہ سرافراز سجدہ ریز تھے درگاہ باری میں
یہ دست و پا تھے خلق اللہ کی خدمت گزاری میں

یہاں محنت کو اپنے حق سے ہوتی تھی نہ محرومی
نہ دیتے تھے یہاں دہقاں خراجِ عجز محکومی

زکوٰۃ و صدقہ و خیرات پاکیزہ کمائی کے
یہاں سامان بنتے تھے غلاموں کی رہائی کے

دلوں میں جاگ اٹھا تھا یہاں احساس خدمت کا
مریض انسانیت کو مل رہا تھا غسل صحت کا

رضا کاری کے رشتہ سے تھا اِس گلشن کا شیرازہ
یہاں مسرور ہر چہرہ تھا، جیسے پھول ہو تازہ

یہاں سرمایہ و محنت سے غائب تھی حدِ فاصل
کہ جس کا نام سرمایہ ہے، محنت ہی کو تھا حاصل

متاعِ محنت و سرمایہ تھے شیر وشکر دونوں
دفاعِ جبرِ شخصی کے لیے سینہ سپر دونوں

یہاں اللہ واحد حیی و قیوم ان کا حاکم تھا
وہ خالق تھا، وہ رازق تھا' وہی رحمٰن و راحم تھا

یہاں مسجد تھی جس میں نور کے فوارے چلتے تھے
یہاں قرآں تھا جس سے فیض کے دریا اُبلتے تھے

یہیں وہ کملی والا ﷺ تھا، محمد ﷺ نام تھا جس کا
جہاں میں صلح و امن و آشتی پیغام تھا جس کا

نہ شخصی دولت و حشمت و تخت و تاج والا تھا
مگر وہ سرورِ کونین تھا، معراج والا تھا

محمد ﷺ مرکزِ خیرِ دو عالم، مخزنِ خوبی
ہمہ اخلاق اور احساں، ہمہ حسن اور محبوبی

وہ مامور من اللہ مذہبِ اسلام کا ہادی ﷺ
دلانے آیا تھا بندوں کو غیر اللہ سے آزادی

محمد ﷺ نے دیا انساں کو جوہر حق نیوشی کا
کہ شب ٹھٹھری ہوئی تھی، مہر چمکا گرمجوشی کا

دماغ و فکر کو، علم و عمل کو زندگی دے دی
خیال و روح، جان و جسم کو پاکیزگی دے دی

نہ حاصل تھی جو قوت بادشاہوں، کجکلا ہوں کو
محمد ﷺ نے وہ بخشی عام مومن کی نگاہوں کو

یہ خوش بختی صلائے عام تھی سارے زمانے کو
نویدِ عزت و اکرام تھی سارے زمانے کو

قدم زن ہو گیا انسان آزادی کی راہوں پر
فلاحِ دین و دنیا چھا گئی سب کی نگاہوں پر

یہاں دہقان خود تھا اپنی کشتِ زیست کا مالی
یہاں مزدور کو حاصل تھا دورِ عیش و خوشحالی

گری برق اخوت خرمنِ بغض و کدورت پر
بحالی آ گئی روندی ہوئی مٹی کی صورت پر

ملی پامال سبزے کو اجازت لہلہانے کی
ہوئی آنسو بھری آنکھوں کو جرأت مسکرانے کی

نظم کی وضاحت

اس نظم میں انسان کامل سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذاتِ پاک ہے جو ہر حوالے سے کامل اور مکمل ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے دونوں جہانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت بنا کر بھیجا۔ آپؐ نے عرب کے جاہلوں کو علم سے نواز دیا۔ بدوؤں کو انسانیت سکھا دی اور اپنی ذات بابرکات سے اس جاہل قوم کو دنیا کے لیے مثال بنا دیا۔ حفیظ آپ ﷺ کی شان بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں جبریل جیسا فرشتہ ہر وقت حاضر ہوا کرتا تھا اور اللہ کا کرم اس آستانے پر ہر وقت جاری و ساری تھا۔ یہاں علم و عظمت اور دانائی کی تعلیم دی جاتی تھی اور ہر خاص و عام فیض حاصل کر رہا تھا۔ جہاں ہر وقت پیشانیاں نورِ ایمانی سے روشن رہتی تھی اور نگاہیں خدا کے لطف کو ڈھونڈتی تھیں۔ یہاں مال و دولت اور مرتبے کی لالچ نہیں تھی بلکہ حضور ﷺ کی عاجزی میں بھی بادشاہت تھی اور جلال و جمال نظر آتا تھا۔

یہاں پر دکھاوے اور دولت سے عزت نہیں ملتی تھی۔ یہاں نہ خوش پوشاکی اور نہ ہی بے جا ستائش تھی بلکہ ہر طرف عاجزی ہی عاجزی نظر آتی تھی۔ یہاں صرف خدا کی رضا کے لیے سب کچھ کیا جاتا تھا۔ دنیاوی جاہ و مرتبے کے لیے نہیں۔ آپؐ کے فیض کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کے ہمراہ رہنے والے صحابی بھی فیض تقسیم کرتے تھے اور لوگوں میں عزت وعظمت بانٹتے تھے۔

اس دربار میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بنی نوع انسان کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دینے، قربان کر دینے کے لیے تیار تھے۔ یہاں مساوات کا درس تھا، رنگ و نسل اور جاہ و منصب کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ یہاں سب محبت کرنے والوں اور عقیدت مندوں کی خواہشات پوری ہوتی تھیں اور شہادت کا جذبہ ہر ایک دل میں معجزن تھا۔ آپ ﷺ کے دربار میں ہر رنگ اور ہر نسل کا باشندہ تھا اور یہ کارواں ایک گلدستے کی مانند تھا جس سے خوشبو آتی تھی جس میں ہر رنگ کا پھول تھا اور عہدے و منصب کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جو لوگ اس دروازے سے منسلک تھے، ان کی شان و شوکت پر فرشتے بھی رشک کرتے تھے۔ اس دربار سے وابستہ خاکی بھی نور سے مالا مال ہو رہے تھے۔ اس دربار میں سب کو سکون اور راحت میسر تھی اور دکھوں کے مارے ہوئے لوگ بھی درِ رسول ﷺ پہ عافیت محسوس کرتے تھے اور مسکراتے ہوئے لوٹتے تھے۔ اس دربار میں آنے والوں کو سب کچھ عطا ہو جاتا تھا۔ پیدل، شاہسوار بنتا تھا اور محکوموں کو بادشاہت عطا ہو جاتی تھی۔

یہاں رہنے والوں کو دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ یہ لوگ اسلام کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس دربار سے وابستہ لوگ صرف حق پرستی پر قائم تھے اور عاجزی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ مجاہد خدا کا نام سن کر

ہے، محنت ہی کو تھا حاصل
لیے سینہ سپر دونوں
تھا' وہی رحمٰن و راحم تھا
سے فیض کے دریا اُبلتے تھے
و آشتی پیغام تھا جس کا
تھا
تھا
ں، ہمہ حسن اور محبوبی
کو غیر اللہ سے آزادی
تھی، مہر چمکا گرمجوشی کا
جسم کو پاکیزگی دے دی
عام مومن کی نگاہوں کو
تھی سارے زمانے کو
گئی سب کی نگاہوں پر
تھا دورِ عیش و خوشحالی
ہوئی مٹی کی صورت پر
کی
کی

کانپ جاتے تھے اور عبادت گزار تھے اور صرف سچائی اور یقین محکم کے قائل تھے۔ یہ عظیم الشان لوگ ہر وقت ذاتِ خدا کے سامنے سربسجود تھے اور ہر وقت عوام الناس کی خدمت کرنا اس کی زندگی کا معمول تھا۔ یہاں لوگوں کو محنت کا پورا معاوضہ ملتا تھا۔ کسی کا حق نہیں مارا جاتا تھا بلکہ زیادہ عطا ہوتا تھا۔ سب لوگ اس طرح اپنے حلال مال اور کمائی سے خیرات اور زکوٰۃ نکالتے تھے اور ان کی اس کمائی سے غلاموں کو آزادی اور رہائی ملتی تھی۔ اس دربار سے وابستہ لوگ انسانیت اور دردمندی کے جذبے سے بھرپور تھے اور ایک دوسرے میں خوشیاں اور مسرتیں بانٹتے تھے۔ یہ وہ چمن تھا جسے خدا کی ذات نے بنایا تھا اور ان لوگوں کے چہرے ہر وقت پھولوں کی طرح تازہ رہتے تھے۔ یہاں سرمایہ داروں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سب لوگ اللہ کی راہ میں محنت کیا کرتے تھے اور اُسی کی کمائی کھاتے تھے۔ مال جمع کرنا نام کو بھی نہ تھا۔ یہاں ساری کمائی خدا کی راہ میں محنت سے آتی تھی، کوئی الگ کمائی نہ تھی اور یہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے والے کسی اور چیز سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو خدا کے علاوہ کسی اور سہارے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کی مساجد پر نورِ الٰہی کی بارش ہوتی تھی اور لوگ قرآن پاک سے فیض حاصل کرتے تھے۔ یہ محمدؐ کا دروازہ تھا۔ یہ اُن کا دربار تھا جنھوں نے دنیا کو امن اور صلح کا پیغام دیا۔ نفرتوں، حسد، کینہ پروری اور دشمنیاں ختم ہوگئی تھیں۔ ہر طرف محبت کے پھول کھلتے تھے۔

یہ وہ ہستی تھی اور ہے جو دنیاوی مال و دولت، حکومت اور تخت و تاج کی پروانہ کرتی تھی بلکہ یہ تخت و تاج کیا چیز تھی دونوں جہاں آپ ﷺ کے لیے بنائے گئے تھے اور آپ ﷺ دونوں جہانوں کے والی، بادشاہ، مالک تھے جنہیں معراج میں قربِ خدا سے نوازا گیا اور یہ مرتبہ آپ ﷺ سے پہلے اور بعد میں کسی کو میسر/نصیب نہ ہوا۔ (آپ ﷺ کے لیے تھا کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ نظم کے حوالے سے تشریح کی ضرورت تھا) آپ ﷺ کا کرم تو دورِ حاضر میں بھی موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گا۔

تجزیاتی نوٹ..... ''انسانِ کامل''

حفیظ جالندھری شعرا کے اُس قبیل سے ہیں جنھوں نے ہندی بحروں کو اردو میں رائج کیا۔ حفیظ الفاظ اور تراکیب سے ترنم اور حسن پیدا کرتے ہیں۔ حفیظ اپنی نظموں میں جدت، خیال اور رعنائی اور جذبات کے حسن سے خوبصورتی پیدا کرتے ہیں۔ حفیظ پاکستانی ترانے کے خالق ہیں اور نظم نگاری، گیت نگاری میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی اسلام دوستی کا ثبوت ان کی مشہور مثنوی شاہنامۂ اسلام ہے۔

زیرِنظر نظم ''انسانِ کامل کی برکات'' آنحضرت ﷺ کی ذات سے عقیدت، محبت کے جذبات کی ترجمان ہے۔ نظم میں حفیظ جالندھری نے اسلام کے سنہری دور میں زندگی کے مختلف مدارج اور اسلامی شعائر کو بڑے دلکش اور عقیدت مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ حفیظ نے عہدِ نبوی ﷺ کی زندگی کی تصویر اس طرح دکھائی ہے کہ پڑھنے والا اپنی آنکھوں کے سامنے مناظر دیکھتا ہے۔ حفیظ نے مترنم الفاظ، جذبات کی فراوانی، عقیدت کی چاشنی سے نظم کو اتنا دلکش بنا دیا ہے کہ پڑھنے والا تصورات کی رو میں بہہ کر اُسی عہد میں چلا جاتا ہے جہاں اُسے حفیظ لے جانا چاہتے ہیں۔

زبان کی خوبصورتی، خیالات کی پاکیزگی، الفاظ کی موسیقیت نظم کے ہر شعر سے عیاں ہے۔ جہاں سادگی ہو جبینیں نورِ ایمانی سے چمکتی ہوں، جہاں نگاہیں لطفِ خداوندی کی متلاشی ہوں، جہاں ستائش کی پروا نہ ہو، جہاں پوشاکوں اور محلات سے محبت نہ پائی جاتی ہو، جہاں مسلسل علم آشتی اور محبت کا فیض جاری ہو، جہاں مال و دولت تفاخر کی علامت نہ ہو، جہاں شاہ و گدا ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں، جہاں سچ کا بول بالا ہو، جہاں شہادت مطلوب و مقصود ہو، جہاں ظاہری حسن، باطنی حسن کے سامنے ماند پڑ جائے۔ جہاں غم زدوں کو راحت ملتی ہو، جہاں حاکم اور محکوم میں فرق مٹ جائے، جہاں صرف حق پرستی کا درس دیا جاتا ہو، جہاں معاشرہ اس قدرت مساوات کا عکاس ہو کہ زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ہو، تو یہ معاشرت کائنات کی سب سے مثالی اور قابلِ رشک معاشرت کیوں نہ کہلائے گی۔

حفیظ نے ترنم اور موسیقیت سے بھرپور الفاظ اور محبت میں ڈبوئے ہوئے قلم کے ساتھ پاکیزہ جذبات و خیالات سے انسانِ کامل کی صفات اُن کے چشمۂ فیض کی برکات اور محبت اور اخوت سے لبریز زندگی اور معاشرت کو ہمارے سامنے اس طرح رکھا ہے کہ دل فرطِ جذبات سے جھوم اٹھتا ہے۔

حفیظ نے جس طرح کی زندگی اور زندگی کے اصول نظم میں دکھائے ہیں اصل میں اسلام کا پیغام اور اسلام کی سچی روح

اسی میں پوشیدہ ہے۔ آپؐ کی زندگی اور اُسوۂ حسنہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ نے دنیا والوں کو الفاظ یا تقریروں یا تصورات نظریات کے ذریعے اسلامی شعائر اپنانے کا درس نہیں دیا بلکہ آپؐ نے سب کے سامنے عملی نمونہ پیش کر کے دکھایا کہ اسلام ایک دین فطرت ہے اور اس کے اصول فطری ہیں جو مفروضے نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔ اسلام نے برتری اور فضیلت کا راز تقویٰ میں رکھ دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ محنت، سچائی اور دیانتداری سے ہی آپ فضیلت کے درجات حاصل کر سکتے ہیں۔

آپؐ کے فرمودات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے آپؐ نے تمام مسائل کا حل علم کو قرار دیا۔ آپ نے اپنا تعارف جب بھی کروایا علم کے حوالے سے کروایا اور آپ کا دروازہ علم وحکمت کا دروازہ ہے۔ جہاں بنی آدم کو اصلاح اور فلاح ملتی ہے۔ آپ نے شاہ اور گدا، بادشاہ اور فقیر کو ایک جیسا ثابت کر کے دکھایا۔ بلالِ حبشی کا مقامِ فضیلت اس بات کا عکاس ہے کہ اس دروازے پر بڑائی صرف محبتِ الٰہی اور مودتِ رسولؐ کے صدقے ملتی ہے۔

حفیظ کی زیرِ نظر نظم جہاں عقیدت ومحبت کا سرچشمہ ہے وہاں فنی حوالے سے ترنم، موسیقیت، دلکشی اور رعنائی سے بھرپور ہے۔

روح الامین: امانت دار روح
جوہر: خوبیاں، اوصاف
عرفان: اللہ تعالیٰ کی پہچان، شنا
الطافِ ربانی: خدا تعالیٰ کے لط
رعب بادشاہی: بادشاہی کا غرو
شرع: احکامِ خداوندی، طور طر
ستائش: اپنی تعریف کرنا
حُریت: آزادی، ذوقِ ارادت
استغنا: غنی ہونا، امیر ہونا، سخی ہو
صدق: سچائی
درگاہِ باری: خدا کی بارگاہ
دہقان: کسان، مزدور
مسرور: خوش
متاعِ محنت: محنت کا پھل، دول
راحم: رحم کرنے والا
حشمت: دبدبہ، رعب
ناظر: دیکھنے والا، نظارہ کرنے وا
بندگی: عبادت
انوارِ ایمانی: ایمان کا نور، روشنی

فرہنگ....انسانِ کامل

روح الامین: امانت دار روح، حضرت جبرئیلؑ کا لقب
جوہر: خوبیاں، اوصاف
عرفان: اللہ تعالیٰ کی پہچان، شناخت
الطافِ ربانی: خدا تعالیٰ کے لطف و کرم
رعبِ بادشاہی: بادشاہی کا غرور، رعب، خوف
شرع: احکامِ خداوندی، طور طریقے
ستائش: اپنی تعریف کرنا
حُریت: آزادی، ذوقِ ارادت، عقیدت مندی
استغنا: غنی ہونا، امیر ہونا، سخی ہونا
صدق: سچائی
درگاہِ باری: خدا کی بارگاہ
دہقان: کسان، مزدور
مسرور: خوش
متاعِ محنت: محنت کا پھل، دولت
راحم: رحم کرنے والا
حشمت: دبدبہ، رعب
ناظر: دیکھنے والا، نظارہ کرنے والا
بندگی: عبادت
انوارِ ایمانی: ایمان کا نور، روشنی

جوئندہ: تلاش کرنے والا
فخرِ تاجداری: بادشاہت کا رعب، دبدبہ اور مشہوری
فیض: فائدہ
بے زر: جس کے پاس دولت نہ ہو، غریب
لبِ گفتار: بولنے کی طاقت
آفت: مصیبت
ناداری: غربت، تنگدستی
سرفراز: بلندی، اونچائی
دست و پا: ہاتھ پاؤں، مکمل طور پر
عجز: عاجزی
حدِ فاصل: ایک حد قائم کرنا، وقفہ
دفاعِ جبرِ شخصی: فردِ واحد کا ظلم
آشتی: امن
سرور: سردار، حاکم، بادشاہ
کونین: دونوں جہاں
شیر و شکر: ملنا جلنا، ایک ہونا
معراج: بلندی، سیڑھی (آنحضرتؐ کا افلاک پر خدا کے نور کو دیکھنا معراج کہلاتا ہے)

تنقیدی پیراگراف

(1)

سوال: مصنف نے موسمِ بہار کی منظر نگاری کس طرح کی ہے۔ مثالوں سے واضح کریں۔ جواب کی طوالت 300 سے 350 الفاظ پر مبنی ہونی چاہیے۔

بنیادی نکات:

☆ مصنف کا اندازِ تحریر لفظی بازی گری۔

☆ منظر نگاری کے لیے حقیقی تصویر کشی۔

☆ بہار کے موسم کی خوبصورتی

آفتاب آخرِ حُوت پر پہنچا اور موسم میں تبدیلی نظر آئی۔ آمدِ بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے، بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے یا تو درختوں پر پتوں کا نام نہ تھا، سب شاخ بلور بنے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے۔ آٹھ دس دن کے بعد کبھی ایک ہلکا سا چھالا پڑ گیا۔ نہریں، حوض، تالاب وغیرہ بلکہ اکثر دریا کہ جم کر آئینہ ہو گئے تھے، پگھلنے لگتے ہیں۔ نہروں کی نالیوں میں چپکے چپکے پانی سرسرانے لگتا ہے۔ پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے پگھل جاتا ہے۔ کناروں پر سبزہ اور سبزے پر کلیاں آ جاتی ہیں۔ درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے، ان میں پھر جان آتی ہے۔ اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا ٹہنیوں پر برف نہیں رہی، کل صبح کو دیکھا تو سبزی تحریر معلوم ہوئی۔ دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کونپلیں، جس درخت کی طرف دیکھو زمرد کی ٹہنیاں بن گئیں۔ آٹھ دس دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے۔ باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کی کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے۔ در و دیوار پر سبزۂ خودرو بھی اُگا تو ایک گلِ خودرو لئے اُگا۔ لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے، نکل کھڑے ہوئے۔ بند کام جاری ہو گئے۔

ادھر گلاب کھلا اُدھر بلبلِ ہزار داستان اُس کی شاخ پر نظر آئی۔ یہ نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے...... چہچہے کرتی ہے۔ گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے، بولتی ہے بولتی ہے...... حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتے رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اُس کے اور بہار کے اور گلِ لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں۔ بعض موقعوں پر جب چہچہ چہچہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اہلِ درد کے دلوں پر ایک عالم گزر جاتا ہے۔ کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا، ہم طبع، ہم نفس زندہ دلی کی اُمنگ میں آ کر باغ میں جاتے ہیں، رات کو وہیں رہتے ہیں، بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہاریں لوٹتے ہیں۔

(محمد حسین آزاد)

(2)

سوال: مصنف نے موسیقی کی باریکیوں اور مہارت کو پیش کرتے ہوئے موسیقی کا تعلق کن چیزوں کے ساتھ جوڑا ہے۔ مثالوں سے واضح کریں۔ آپ کا جواب 300 سے 350 الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے۔

بنیادی نکات:

☆ موسیقی کی روایت اور تاریخ۔

☆ موسیقی کی وسعت۔

☆ ساز اور آواز کا رشتہ اور تاثیر۔

ہماری موسیقی اتنی ہی پرانی ہے جتنی برصغیر کی تاریخ۔ چار پانچ ہزار سال پرانی داستانوں میں ہمیں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ''رگ وید'' میں بھی اس کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے تمام فنونِ لطیفہ مثلاً مصوری، مجسمہ سازی، رقص اور شاعری کی طرح موسیقی کی بنیاد بھی مذہبی ہے اس لیے کہ شروع شروع میں تمام فنون کا مقصد اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف کرنا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ سب اپنے آپ میں ایک مکمل فن بن گئے، پھر بھی ہمیں آج تک اس رشتے کے نشانات ملتے ہیں مثلاً شاعری میں حمد، مصوری میں مسجدوں اور گرجا گھروں میں بنائے گئے نقش و نگار، مجسمہ سازی میں مہاتما بدھ اور عیسیٰ مسیح کے مجسمے وغیرہ۔ اسی طرح موسیقی میں بھی مذہبی جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مثلاً قوالی یا مندروں میں گائے جانے والے بھجن، خالصتاً کلاسیکی موسیقی میں بھی یہ اثر نظر آتا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کی ایک دھن کے بول ہیں ''تو ہی سب کا پالن ہار'' آج بھی گانے والے اس دھن کو ان ہی بولوں کے ساتھ گاتے ہیں۔

برصغیر میں موسیقی کی جڑیں کئی ہزار سال پرانی ہیں مگر جتنی ترقی اس میں مسلمانوں کے برصغیر میں بسنے کے بعد ہوئی اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ جب دو تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں تو سوچ اور اظہار کے نت نئے پیرائے سامنے آتے ہیں۔

سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی۔ ان سات سُروں کو تو آپ پہچانتے ہیں۔ بقیہ کو ہم، رے کومل، گا، کومل، ما، تیور، دھا، کومل اور نی، کومل کہتے ہیں۔ تمام دنیا کی موسیقی کو ان بارہ برابر کے ٹکڑوں میں بانٹا گیا ہے۔

ہمارے موسیقاروں نے ان بارہ سُروں کے درمیان مزید نو سُر دریافت کیے ہیں۔ عام سننے والے کے لیے ان اکیس سُروں کو علیحدہ علیحدہ شناخت کرنا ممکن نہیں مگر اچھے گانے والے اپنے گلے اور ساز بجانے والے اپنے ساز سے یہ سارے سُر سنانے پر قدرت رکھتے ہیں اور سننے والا چاہے شناخت کر سکے یا نہیں، مزہ ضرور لیتا ہے۔ ہارمونیم، پیانو یا سانس سے بجائے جانے والے سازوں میں ان تمام سُروں کی ادائیگی ممکن نہیں مگر سارنگی، ستار، وائلن یا گز سے بجائے جانے والے سازوں میں یہ ممکن ہے۔ سارنگی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شاید واحد ساز ہے جو سارے سُر اُس انداز میں ادا کر سکتا ہے جیسے گانے والا اپنے گلے سے ادا کرتا ہے۔

(راحت کاظمی)

(3)

سوال: راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''گرم کوٹ'' طبقوں میں تقسیم معاشرے کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ ذیل میں افسانے کا اقتباس دیا گیا ہے جو طبقاتی تقسیم کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد آپ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟ آپ کا جواب 300 سے 350 الفاظ پر مبنی ہونا چاہیے۔ جواب کے لیے آپ ان نکات کو بیان کر سکتے ہیں۔

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے گھر کا نظام چلانا ناممکن ہے۔

☆ آج کے دور میں ایک عام آدمی کے لیے بچوں کی پرورش ایک سوالیہ نشان ہے۔

☆ استحصال زدہ طبقے کی خواہشات دل میں ہی دم توڑ جاتی ہیں۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لیے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنا پڑتی ہیں اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لیے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے...... یہ گرم کوٹ میں نے پار سال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سیکڑوں گانٹھیں کسی مرانجا مرانجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے ''مرانجا مرانجا اینڈ کو'' کا لیبل لگا ہوا تھا مگر کوٹ مجھے ملا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار سستا روئے بار بار...... اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آتے ہوئے میں ارادتاً انارکلی میں سے گزرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا، دال، ایندھن، بجلی، بیمہ، کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا...... جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گزرنا معیوب نہیں۔ اس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور ساڑھیاں۔ چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ گزشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ شاید اسی لیے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں، ایسی شان و شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا ''کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماردوں؟'' لیکن کچھ عرصے کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِعمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اسے بل دینے لگا، چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آ گئی تھی، اس لیے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپناوہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

(راجندر سنگھ بیدی)

ساتھ جوڑا ہے۔ مثالوں

کا ذکر ملتا ہے۔ ''رگ وید''
طرح موسیقی کی بنیاد بھی
ی حاصل کرتا تھا۔ آہستہ
عری میں حمد، مصوری میں
رح موسیقی میں بھی مذہبی
اثر نظر آتا ہے۔ حضرت
کاتے ہیں۔
سنے کے بعد ہوئی اس کی
ئے سامنے آتے ہیں۔
کومل، گا، کومل، ما، تیور،

لے کے لیے ان اکیس
، یہ سارے سُر سنانے پر
ے بجائے جانے والے
یں یہ ممکن ہے۔ سارنگی
گلے سے ادا کرتا ہے۔
(راحت کاظمی)

(4)

سوال: اقبال کی شاعری میں عربی تلمیحات واستعارات کا وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ان کی اسلام دوستی بھی ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ آپ مصنف کی رائے سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں؟ تفصیل سے بتائیں (جواب کی طوالت 300 سے 350 الفاظ)

بنیادی نکات:

☆ جواب کے لیے مصنف کی دی گئی مثالوں سے مدد لیجیے۔

☆ اقبال کی شاعری میں وسعت اور موضوعات کی فراوانی کا تذکرہ کریں۔

اقبال نے اپنی شاعری کے لیے سرزمین عرب سے روشنی اور توانائی حاصل کی۔ چنانچہ اقبال کے بیشتر اردو کلام کے پس منظر میں عرب کی اسلامی روایت کارفرما ہے۔ان کے ہاں عربی اور اسلامی تلمیحات اور استعاروں کا ذخیرہ جس وافر انداز میں موجود ہے وہ اردو شاعری کی تین سو سالہ تاریخ میں کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ان کی شاعری کا مرکز ومحور ''ریگ نواح کاظمہ'' ہے جہاں سے وہ اپنے شعری افکار کے لیے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اقبال نے ان تمام تلمیحات اور علامتوں کو جن کا عکس ہم گزشتہ سطور میں دیکھ آئے ہیں۔ اسلام کے ہمہ گیر اور آفاقی تصور کے آئینے میں رکھ کر منعکس کیا ہے۔صحرائے عرب سے انہیں قلبی وابستگی ہے اور یہ قلبی وابستگی، جذباتی اور فکری دونوں سطح پر ان کے اشعار میں موجود ہے۔قرآن پاک، احادیث کے مفاہیم کا استعمال اس امر کا بین ثبوت ہے۔ اقبال کی یہ روایت اگرچہ اردو شاعری کی باقاعدہ روایت تو نہ بن سکی، تاہم اقبال کے شعری اسلوب اور عربی سے براہ راست استفادے کی جھلک بیسویں صدی کے چند دیگر شعرا کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ ان میں مولانا ظفر علی خان اور عبدالعزیز خالد کے نام اہم ہیں لیکن ان شعرا کے ہاں شاعری کی وہ فکری سطح نمودار نہیں ہوسکی جو اقبال کے ہاں موجود ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی آفاقیت نے اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والے شعراء کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کسی نئی فکر کا ڈول ڈال سکیں یا اقبال ہی کی فکر کو مزید وسعت دے سکیں۔

(ڈاکٹر عبدالکریم خالد)

(5)

سوال: اردو زبان کی ترویج اور نشوونما میں فارسی اور عربی زبان نے کیا کردار ادا کیا اور اس کا اردو زبان کو کیا فائدہ حاصل ہوا۔ تفصیل سے بتائیں۔ (جواب کی طوالت 300 سے 350 الفاظ)

بنیادی نکات:

☆ فارسی اور عربی زبان اردو کی بقا کی کیسے ضامن بنی؟

☆ عربی اور فارسی سے اردو شعرا نے کیسے استفادہ کیا؟

☆ کیا اردو کی ترقی میں مغربی زبانوں کا بھی کوئی کردار ہے؟

سولہویں اور سترہویں صدی اردو زبان کے آغاز اور اس کی تشکیل کی صدی ہے۔ اردو زبان جسے ہندوستان کے شعروادب کا مقدر بننا تھا، کی تشکیل اور نشوونما میں عربی اور فارسی نے بہت اہم کردار ادا کیا اور اردو کو ایک ایسی مضبوط بنیاد فراہم کر دی جس پر تعمیر ہونے والی عمارت آج تک نہ صرف قائم ہے بلکہ زمانے کی تند و تیز ہوائیں اور بڑے بڑے طوفان بھی اس میں شکستگی کے کوئی آثار پیدا نہیں کر سکے۔ غور کیا جائے تو اردو زبان کی نشو و ارتقا اور ترویج و ترقی میں فارسی سے زیادہ عربی زبان کا کردار اہم ہے۔ اسی وجہ سے اسے مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا ہے۔ فارسی بھی اگرچہ مسلمانوں ہی کی زبان تھی لیکن وہ بھی اپنی تہذیب و ترقی میں عربی سے دامن نہیں چھڑا سکی۔ عربی پہلے ہی سے اس کے شعروادب کا رخ بدل چکی تھی۔ چنانچہ جب وہ اپنی بدلی ہوئی شکل لے کر ہندوستان پہنچی تو یہاں بھی عربی زبان اس کے استقبال کے لیے پہلے سے موجود تھی اور ہندوستان کی سرزمین پر ان دونوں زبانوں کا ملاپ نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ اردو زبان نے جب پھل پھول کر ادب کی وادی میں قدم رکھا تو سب سے پہلے شاعری ہی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اردو شعرا اگرچہ فارسی روایت کے اسیر تھے اور اس کی وجہ ظاہر ہے ان کا فارسی ادب سے براہ راست اور مسلسل رابطہ تھا جو شمال مغرب کی جانب سے مسلسل پہنچنے والی شعروادب کی کمک کی صورت میں استوار تھا لیکن ایمان و اخلاق کے معاملے میں ان کے پیش نظر صرف عربی زبان ہی تھی۔ عقائد، اخلاق، عبادات کی تمام صورتیں عربی زبان ہی کے پیکر میں وجود پذیر ہوئیں۔ چنانچہ مذہب و اخلاقیات کے ضمن میں تمام تر مواد انہیں عربی زبان ہی فراہم کر سکتی تھی۔

(ڈاکٹر عبدالکریم خالد)

(6)

سوال: جھوٹ بولنے کے فلسفے کو مصنف نے کس طرح طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ تفصیل سے بتائیں۔ آپ کا جواب 300 سے 350 الفاظ پر مبنی ہونا چاہیے۔ آپ درج ذیل نکات سے مدد لے سکتے ہیں۔

بنیادی نکات:

☆ لوگ کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟

☆ کیا جھوٹ وقتی طور پر فائدہ مند ثابت ہوتا ہے؟

☆ ہم جھوٹ بولنے کے بعد اپنے آپ کو کس طرح مطمئن کر سکتے ہیں؟

میں نے اظہر کو بلا کر کہا ''اظہر! تمہارے ابا شکایت کرتے ہیں کہ تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔'' اظہر کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اُس نے حیران اور ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا ''نہ۔ نہیں میں جھوٹ نہیں بولتا۔ پر ابا جی مارتے ہیں۔'' ان مختصر الفاظ میں اُس چھوٹے سے لڑکے نے جھوٹ کا تمام فلسفہ بیان کر دیا یعنی مخصوص حالات میں جھوٹ ایک کارآمد چیز ہے جو زیادہ تر اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ جس طرح عالمِ طفلی میں بچوں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ماں کی محبت کو حاصل کرنے کے لیے رونا، روٹھنا، ضد کرنا اور بیمار پڑ جانا بہت مفید ہے۔ اسی طرح کسی روز اُن پر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ابا کی تیوریوں اور ماسٹر کی مار پیٹ سے بچنے کے لیے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے۔

شاید آپ نے کبھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہو اور یہ محسوس کیا ہو کہ جھوٹ بولتے ہوئے دل یوں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے گویا کہہ رہا ہو ''بھئی تم جانو تمہارا کام، میں اس بات میں دخل نہیں دیتا۔'' آنکھیں قطعی بھول جاتی ہیں کہ ان حالات میں اُنہیں کس قدر کھلا رہنا چاہیے اور کدھر دیکھنا چاہیے۔ ہاتھ حیرانی میں شانوں سے نیچے یوں آوارہ لٹکتے ہیں گویا کسی لامتناہی خلا میں آویزاں ہوں۔ اُس وقت آواز بھی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی جیسے کوئی درد بھرا گیت چُست سُروں میں گایا جا رہا ہو اور جسم کی نس نس ہم کو جھٹلانا شروع کر دیتی ہے۔ جھوٹ! جھوٹ! اس کے باوجود اگر کوئی ہمارے جھوٹ کو سچ مان لے تو یہ اُس کا حسنِ اعتقاد ہے۔

میرا اپنا تجربہ ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے اس قدر پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے کہ معاً دل میں یہ آرزو پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر اب کی بار خفت سے بچ جاؤں تو گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے باقی عمر اللہ کی یاد میں بسر کروں گا۔ شاید اسی ڈر کے مارے میں زیادہ تر جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کرتا یعنی راست گوئی میرے لیے ایک ناخوشگوار مجبوری ہے۔

ہم سب فطری طور پر راست گو ہیں۔ البتہ ہم جھوٹ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ انسان فطرتاً کافر نہیں بلکہ مومن جانور ہے۔ ہماری جملہ مشکلات کی وجہ ہماری دروغ گوئی نہیں بلکہ خوش اعتقادی ہے۔ ہم صرف اُن باتوں پر ایمان لے آتے ہیں جن سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہی جھوٹ بولتے ہیں جو ہمارے لیے خوش کن ہوں۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں تو میرا مطلب یہ ہوگا کہ آپ کی بات مجھے اچھی نہیں معلوم ہو رہی یا وہ میرے مطلب کے مطابق نہیں۔

(ممتاز مفتی)

(7)

سوال: اردو نظم کی ترقی میں مولانا حالی اور مولانا آزاد نے کیا خدمات سرانجام دیں۔ تفصیل سے بحث کریں۔

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ جدید نظم نگاری میں حالی اور آزاد کی خدمات۔

☆ زمانے کے ساتھ ساتھ نظم کا ارتقائی سفر بھی جاری ہے۔

☆ موجودہ دور میں نظم پسندیدہ صنفِ شاعری ہے۔

☆ جواب کے لیے پیراگراف کے ساتھ اردو نظم پر کوئی مضمون پڑھیے۔

آج کی نظم مولانا حالی کی اصلاحِ معاشرہ تحریک سے اتنی آگے نکل چکی ہے کہ اب اسے منبروں، مجلسوں یا محفلوں میں تلاش کرنے کے بجائے کسی بھی عام سی جگہ پر دیکھا یا سنا جا سکتا ہے۔ اسے کسی خاص دائرے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی نظم اپنے وسیع امکانات کے ساتھ کائنات کے طول و عرض میں پھیل چکی ہے اور ان سیارگان کی خبر لاتی ہے جو سو سال پہلے کے شاعر کے گمان سے بھی پرے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اردو نظم کی اس زبردست ترقی کے سبب موجودہ دور میں مولانا حالی اور آزاد کے تصورات کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر وہ شاعر جو اپنا مخصوص پس منظر رکھتا ہے اور اپنے کسی خاص رجحان کے باعث شعری روایت کا قابلِ لحاظ حصہ بن چکا ہے، آنے والے زمانوں میں کہیں نہ کہیں اپنے لیے ضرور جگہ بناتا ہے۔ میر و غالب ہی کو لیجیے، ہرچند کہ آج کا شاعر جدیدیت کی دوڑ میں بہت آگے نکل چکا ہے لیکن اس دوڑ میں کسی نہ کسی مقام پر ان دو بڑے شاعروں سے اس کا سامنا ضرور ہوتا ہے۔ مولانا حالی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ان کے دور میں سماجی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر جو خرابیاں موجود تھیں، وہ سو سال بعد آج بھی اسی طرح قائم ہیں۔

(ڈاکٹر عبدالکریم خالد)

(8)

سوال: کسی بھی مشغلے میں حد سے زیادہ دلچسپی گھریلو مسائل کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح اکثر لوگ گھریلو معاملات میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ کیا شطرنج کی بنیاد پر مسائل پیدا ہوئے یا؟ آپ کسی واقعے کی روشنی میں یہ بات ثابت کریں۔

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ کسی بھی خاندان کے سربراہ کو گھریلو معاملات کو سب کاموں پر ترجیح دینی چاہیے۔

☆ اپنے مشغلے کی وجہ سے گھر کو نظر انداز کرنا تباہی کا باعث ہے۔

☆ ہر کام میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔

میر صاحب کی بیگم کسی وجہ سے میر صاحب کا گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے مشغلہ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ الکساتے تو سر و دیہ مستان یاد دہانیدن کے مصداق انہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گماں ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق، متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں، لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں حرج پیدا ہونے لگا تو انہیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں۔ سوچنے لگیں کیونکر یہ بلا سر سے ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا، اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا، کبھی لانے، کبھی برف لانے کا، کبھی تمباکو بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے "حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے۔ جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلے والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔" بیگم صاحبہ کہتیں "مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا، پر کیا کروں میرا کیا بس ہے۔"

(پریم چند)

(9)

سوال: تقسیم ہندوستان کے حوالے سے منٹو نے اپنے نظریات کی وضاحت کے لیے ایک پاگل خانے کا منظر پیش کیا ہے۔ آپ مصنف کے خیالات سے کس حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ دلائل سے ثابت کریں۔ آپ ذیل میں دیئے گئے نکات سے مدد لے سکتے ہیں۔

بنیادی نکات:

☆ کیا تقسیم ہندوستان دلوں کی تقسیم بھی تھی؟

☆ اپنا گھر، علاقہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔

☆ معروضی رشتے تمام رشتوں سے مضبوط ہوتے ہیں۔

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں، انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں، انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہرحال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق اِدھر اُدھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیئے گئے جو باقی تھے ان کو سرحد پار روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو سکھ جا چکے تھے، اسی لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ جتنے ہندو سکھ پاگل تھے، سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا دیئے گئے۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ کہ پاکستان کیا ہے لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرے دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگو سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنا دیا ہے جس کا نام پاکستان ہے...... یہ کہاں ہے، اس کا محل وقوع ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں...... اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے۔ اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے۔

(سعادت حسن منٹو)

(10)

سوال: عصمت چغتائی نے نانی کے برقعے کو طنز کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ ایک غریب اور نادار کی زندگی سے پردہ ہٹایا ہے۔ کہانی کے اقتباس کو پڑھ کر آپ کے ذہن میں کیا سوال ابھرتے ہیں؟ تفصیل سے بتائیں۔

بنیادی نکات:

☆ نانی کا برقع اُس کی غربت کو کس طرح چھپاتا تھا؟

☆ نانی کے برقعے کا استعمال اس کی غربت کا ترجمان ہے۔

☆ عصمت چغتائی کا جاندار اندازِ تحریر۔

چور اور چکمہ باز ہونے کے علاوہ نانی پرلے درجہ کی جھوٹی بھی تھیں۔ سب سے بڑا جھوٹ تو ان کا وہ برقع تھا جو ہر دم ان کے اوپر سوار رہتا تھا۔ کبھی اس برقع میں نقاب بھی تھی پر جوں جوں محلّہ کے بڑے بوڑھے چل بسے یا نیم اندھے ہو گئے تو نانی نے نقاب کو خیر باد کہہ دیا مگر کنگوروں اور فیشن ایبل برقع کی ٹوپی ان کی کھوپڑی پر چپکی رہتی۔ آگے چاہے مہین کُرتے کے نیچے بنیان نہ ہو پر پیچھے برقع بادشاہوں کی جھولی کی طرح لہراتا رہے اور یہ برقع صرف ستر ڈھانکنے کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ دنیا کا ہر ممکن اور ناممکن کام اسی سے لیا جاتا تھا۔ اوڑھنے بچھانے اور گڑی مڑی کر کے تکیہ بنانے کے علاوہ جب نانی کبھی خیر سے نہاتیں تو اُسے تولیہ کے طور پر استعمال کرتیں۔ پنج وقتہ نماز کے لیے جائے نماز اور جب محلّہ کے کتے دانت نکوسیں تو اُن سے بچاؤ کے لیے اچھی خاصی ڈھال۔ کتا پنڈلی پر لپکا اور نانی نے برقع کا گھیر اس کے منہ پر پھنکارا۔ نانی کو برقع بہت پیارا تھا۔ فرصت میں بیٹھ کر حسرت سے اس کے بڑھاپے پر بسورا کرتیں۔ جہاں کوئی چندی کتر ملی اور احتیاطاً پیوند چپکا لیا۔ وہ اس دن کے خیال سے ہی لرز اٹھتی تھیں جب یہ برقع بھی چل بسے گا۔ آٹھ گز لٹھا کفن کو جڑ جاوے یہی بہت جانو۔ نانی کا کوئی مستقل ہیڈ کوارٹر نہیں۔ سپاہی جیسی زندگی ہے۔ آج اس کے دالان میں تو کل اُس کی صحنچی میں۔ جہاں جگہ ملی پڑاؤ ڈال دیا۔ جب دھتکار پڑی کوچ کر کے آگے چل پڑیں۔ آدھا برقع اوڑھا آدھا بچھایا یا لمبی تان لی۔ مگر برقع سے بھی زیادہ جس کی فکر میں گھلتی تھیں وہ تھی ان کی اکلوتی نواسی ننھی۔ کڑک مرغی کی طرح نانی پَر پھیلائے اُسے پوٹلے تلے دابے رہتیں۔ کیا مجال جو نظر سے اوجھل ہو جائے مگر جب ہاتھ پیروں نے جواب دے دیا تو محلّہ والے چوکنے ہو گئے.....!

(عصمت چغتائی)

(11)

سوال: مصنف نے اجرک کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ مثالوں سے واضح کریں۔ جواب کے لیے آپ ان نکات سے مدد لے سکتے ہیں۔

بنیادی نکات:

☆ سندھیوں کی ثقافت اور روایات۔

☆ اجرک کی اہمیت۔

☆ اجرک کا استعمال۔

مہران کی جوبی نرم وادیوں پر محیط سندھ کا خوش نصیب خطہ چین، عراق اور مصر کی طرح تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ دریائے سندھ نے اپنے کنارے علم وہنر کو پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے دیکھا۔ اس کی وادیوں میں پہلے پہل آباد ہونے والے نہ صرف اچھی شہری منصوبہ بندی اور فنِ تعمیر میں طاق تھے بلکہ صنعت حرفہ کے بھی استاد تھے۔ علم وفضل کی انگلی پکڑ کر پوری دنیا جدید صنعتی دور میں داخل ہوگئی۔ زمانے کے انداز بدل گئے مگر سندھی تہذیب وثقافت کا کمال یہ ہے کہ اُس نے صدیوں پرانی معاشرتی روایات سے مکمل طور پر دامن نہیں چھڑایا۔ جس طرح صحرا میں اونٹ اور دریا میں کشتی کا سندھ کے باشندوں کی بود وباش سے ہمیشہ سے گہرا تعلق رہا ہے اسی طرح اجرک تن پوشی کے معاملے میں دیرینہ روایتوں کی امین ہے۔

لفظ اجرک عربی اور فارسی اسم "ازرق" کی سندھی شکل ہے، جس کے معنی ہیں نیلا جبکہ اجرک سندھ کے ایک افسانوی دلکشی کے حامل کپڑے کا نام ہے جو محض تن پوشی کے لیے نہیں پہنا جاتا بلکہ سندھی ثقافت کی مقدس شناخت سمجھا جاتا ہے۔ تہواروں، دعوتوں اور اہم موقعوں پر اس کی پوشش قابلِ فخر اور وطن کی مٹی سے جذباتی وابستگی کی آئینہ دار سمجھی جاتی ہے۔ سرکاری وغیر سرکاری مہمانوں کو خلعت فاخرہ کے طور پر تحفے میں دی جاتی ہے۔ گاؤں، گوٹھوں میں لوگ اسے بچوں کے پالنوں، عورتوں کے گھاگھروں، چنریوں، پلنگ پوشوں اور شانوں کے آرائشی رومال کی طرح استعمال کرتے ہیں تو شہروں میں لوگ اسے سندھی قومیت کی علامت کے طور پر فخریہ زیب تن کرتے ہیں۔ صوفیوں کے حجرے ہوں یا وڈیروں کے اوطاق، ہاری کی جھونپڑی ہو یا فنکار کا گوشۂ عافیت، اجرک ہر سو رنگا رنگ جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔

(شمیم اختر)

(12)

سوال: ''رستم وسہراب'' کی کہانی تجسس کی معراج ہے۔کہانی کے نقطہ عروج تک پہنچنے تک قاری کے کیا تاثرات ہوتے ہیں، بحث کریں۔آپ کا جواب 300 سے 350 الفاظ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جواب کے لیے ذیل میں دیئے گئے نکات سے مدد لی جاسکتی ہے۔

بنیادی نکات:

☆ آغا حشر کا فنِ ڈراما نگاری۔

☆ کہانی کی دلچسپی اور نقطہ عروج۔

☆ المیہ انجام اور قاری کے تاثرات۔

ڈرامے کا فن بہت پرانا ہے۔ برصغیر میں اس فن کی ابتدا سنسکرت ڈراموں سے ہوئی جس میں شری کرشن اور رام چندر جی کی زندگی کے واقعات تہواروں کے موقعوں پر ڈرامے کی شکل میں پیش کیے جاتے تھے۔

اردو ڈرامے کی باقاعدہ ابتدا واجد علی شاہ کے عہد میں ہوئی لیکن ڈرامے کو اردو ادب کا حصہ بنانے کا اعزاز آغا حشر کاشمیری کو حاصل ہے جنہیں انڈین شیکسپیئر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے ادبی اور فنی لحاظ سے بہترین ڈرامے لکھے۔''صید ہوس''، ''یہودی کی لڑکی'' اور ''رستم وسہراب'' ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔''رستم وسہراب'' اُن کا آخری ڈراما ہے جسے انہوں نے ''شاہنامہ فردوسی'' سے براہ راست اردو میں منتقل کیا۔ یہ شاہنامہ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل رزمیہ مثنوی ہے جس کے ایک حصہ ''رستم وسہراب'' کو حشر نے ڈرامائی شکل دی۔ڈرامے کا انجام دردناک اور مرکزی نقطہ یہ ہے کہ تقدیر کا لکھا ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔قصہ کچھ یوں ہے کہ ایران کا مشہور سپہ سالار رستم شکار سے واپسی پر راستہ بھول کر شاہ سمنگان کے محل میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات شاہ کی بیٹی تہمینہ سے ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کر بیٹھتے ہیں۔ وہ تہمینہ کو ایک مہرہ دیتا ہے کہ اگر اُس کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو مہرہ اُس کے بازو پر باندھ کر اُسے رستم کے پاس بھیج دیا جائے۔ رستم کے جانے کے بعد تہمینہ کے یہاں سہراب کی ولادت ہوتی ہے لیکن وہ بیٹے کی جدائی سے بچنے کے لیے رستم کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر بھجوا دیتی ہے۔ رستم واپس نہیں لوٹتا اور ایک عرصہ بیت جاتا ہے۔ سہراب جوان ہو کر باپ سے ملنے کے لیے بے تاب رہتا ہے لیکن اُس زمانے کی ملکی سیاست اور بادشاہوں کی سازش باپ بیٹوں کو ملنے نہیں دیتی۔ اسی سازش کی بنا پر باپ ایرانی اور بیٹا تورانی فوج کی طرف سے ایک دوسرے کے مدمقابل آ کھڑے ہوتے ہیں۔ سہراب آخری وقت تک رستم کا متلاشی رہتا ہے لیکن حقیقت سے پردہ اُس وقت اٹھتا ہے جب وہ باپ کے ہاتھوں شکست کھا کر شدید زخمی ہوتا اور چند ثانیوں بعد مر جاتا ہے۔

(آغا حشر کاشمیری)

13

سوال: مصنف نے مرچ کی تاریخ، استعمال، فائدے اور نقصان بڑی وضاحت سے بیان کیے ہیں۔ آپ کس حد تک مصنف کی باتوں سے متاثر ہوئے ہیں؟ تائید یا تردید کے لیے مفصل دلائل پیش کریں۔

بنیادی نکات:

☆ مرچ کے استعمال کی تاریخ اور فوائد۔

☆ دلائل میں حقیقت کا عنصر۔

☆ مرچ کے استعمال میں مشرق اور مغرب کا تضاد۔

برصغیر پاک و ہند کے علاقوں میں مرچ کثرت سے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی 90 اقسام ہیں۔ یہ مختلف شکلوں میں دستیاب ہے۔ موٹی، لمبی یا گول طرز کی۔ اس کی تیزی بھی قسموں کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوتی ہے۔ چھوٹی مرچ زیادہ تاثر رکھتی ہے۔ پاکستان کے علاقے تھرپارکر میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ امریکہ میں اس کی تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔ وہاں کے اصل باشندے مرچ کو اپنے کھانے میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پانچ ہزار سال پہلے سے استعمال کر رہے ہیں۔ 1611ء میں پرتگیزوں نے اسے جنوبی امریکہ سے ہندوستان میں متعارف کرایا۔

اس کے بغیر ذائقے دار لذیذ کھانوں کا تصور بھی ناممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہان کے عہد میں جمنا سے نہر نکال کر جب دہلی لائی گئی تو اسے شہریوں کی صحت کے لیے نقصان دہ قرار دیا گیا اور یہ مشورہ دیا گیا کہ کھانے میں سرخ مرچ کا استعمال زیادہ کر دیا جائے تاکہ نزلہ زکام بہہ کر ریشہ خارج ہو جائے۔ چین اور جنوبی امریکہ میں اس کا استعمال عام ہے۔ یہاں کے لوگوں کے پھیپھڑے مرچ کا استعمال نہ کرنے والے لوگوں کی بہ نسبت صاف رہتے ہیں۔ یہ دوران خون کو بڑھاتی ہے جس سے پسینہ آتا ہے اور گرم ملکوں میں یہ گرمی کا اثر کم کرتی ہے۔ اس سے موٹاپا بھی کم ہوتا ہے۔ سردیوں میں بھی نزلے زکام سے نجات پانے کے لیے دہلی کے رہنے والے تیز مرچوں والی نہاری کھاتے ہیں۔

سنا گیا ہے کہ درد یا چوٹ کے مقام پر (زخم پر نہیں) سرخ مرچ کا لیپ کر کے سینکنے سے اس کا درد کم ہو جاتا ہے۔ جلن تو ہوتی ہے لیکن درد کی ٹیسیں کم ہو جاتی ہیں۔ مغربی ممالک میں زیادہ تر کالی مرچ کا استعمال ہوتا ہے۔ اکثریت سرخ مرچ استعمال کرنے سے پرہیز کرتی ہے۔ ان کے خیال میں اس کا استعمال معدے کا السر پیدا کرتا ہے اور یہ بواسیر کا باعث بھی بنتی ہے۔

(14)

سوال: اہرامِ مصر کی تاریخ، مصریوں کے عقائد اور بادشاہوں کی تدفین پر 300 سے 350 الفاظ پر مبنی ایک تنقیدی نوٹ لکھیں۔

بنیادی نکات:

☆ مصریوں کا عقیدہ۔

☆ فنِ تعمیر۔

☆ عجائبات۔

اہرامِ مصر کا شمار دنیا کے مشہور ترین اور حیران کن عجائبات میں ہوتا ہے۔ یہ اُہرام دراصل مصری بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے مقبرے ہیں۔ یہ مثلث کی شکل میں نیچے سے چوڑے اور اوپر بتدریج پتلے ہو۔تے ہوئے ایک چوٹی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ نیچے سے چوڑائی زیادہ ہونے کی ضرورت اس لیے تھی کہ مرنے والے بادشاہ اور ملکہ کا ساز و سامان، ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کے زیورات اس کے آس پاس رہیں تا کہ دوبارہ جنم لینے پر اُسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو اور ضرورت کی ہر چیز اُس کے پاس ہو۔ اوپر سے پتلا رکھنے کی یہ وجہ تھی کہ زندہ ہونے کے بعد اہرام کی بلند چوٹی کے ذریعہ سورج دیوتا تک بہ آسانی پہنچ سکے۔

مصری، سورج اور بادشاہ دونوں کو دیوتا مان کر اُن کی پوجا کرتے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ جس طرح سورج روز ڈوبتا اور ابھرتا ہے اُسی طرح بادشاہ جو دیوتا کے انسانی روپ میں مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ یہی عقیدہ اہرامِ مصر کی بنیاد بنا۔ چونکہ سورج مغرب میں ڈوبتا تھا اس لیے سارے اہرام مصر دریائے نیل کے مغربی کنارے پر تعمیر کیے گئے۔ افسوس کہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی تلاش میں دنیا بھر کی اقوام نے اہرام کی کھدائیاں کیں اور انہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ سونے چاندی ہیرے جواہرات کے ساتھ بادشاہوں کی لاشیں بھی غائب کر دی گئیں۔

مصری نہ صرف فنِ تعمیر میں ماہر تھے بلکہ جسم کو ابدی طور پر محفوظ کرنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ لاش کے ان حصوں کو جن کے گلنے سڑنے کا خدشہ ہو جیسے دل، دماغ، آنتیں وغیرہ نکال کر اُن جگہوں کو مخصوص مصالحے سے بھرا جاتا تھا۔ پھر جسم کے ہر عضو پر قیمتی اور نایاب کپڑوں کی پٹیاں لپیٹ دی جاتی تھیں۔ بعد ازاں ان مصالحے شدہ جسموں کو قیمتی تابوتوں میں بند کر کے ان کو اہرام کے شاہی ایوانوں میں رکھ دیا جاتا تھا اور اندر پہنچنے کے راستے کو بھاری سِلوں سے اس طرح بند کر دیا جاتا تھا کہ راستے کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

(15)

سوال: انسانی تفریح کے ذرائع ارتقا کے نقطہ عروج تک پہنچ گئے ہیں۔ نانی اماں کی کہانیوں کے خلوص اور کمپیوٹر کی وسعت کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے ایک مفصل تنقیدی نوٹ لکھیں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ ذہنی تفریح انسان کی ضرورت۔

☆ ارتقائی تبدیلیوں کا سفر۔

☆ کمپیوٹر کی ایجاد اور اثرات

زمانہ قدیم سے انسان تفریح کا سامان ڈھونڈتا آیا ہے۔ پہلے زمانے میں گاؤں کے لوگ رات کو کھانا کھا کر دن بھر کی تھکن دور کرنے چوپال میں جمع ہو جاتے تھے۔ ماہر قصہ خواں موجود ہوتا تھا۔ کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ کچھ فرضی ہوتی تھیں اور کچھ حقیقی۔ پشاور کا بازار قصہ خوانی آج بھی بیتے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ رات کو بچے سونے سے پہلے دادی اماں کے گرد گھیرا ڈالتے۔ کہانی کی شروعات ''کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ'' ننھے منے بچوں کی دلوں میں تجسس اور اشتیاق کی لہر دوڑا دیتی۔ کہانی خواہ فرضی ہو یا اصلی، دادی اماں کی زبانی ہو یا قصہ خواں کی۔ ایک بات طے تھی کہ اچھائی کا انعام اور برائی کی سزا ضرور ملے گی۔ اس طرح کہانی نہ صرف ذہنی تفریح مہیا کرتی بلکہ اصلاحی پہلو بھی رکھتی تھی اور ایک دوسرے کو قریب لانے کا ذریعہ بھی تھی۔

پھر کہانیوں کا سلسلہ ختم ہوا۔ تھیٹر، فلمیں اور ٹیلی ویژن وجود میں آئے اور اب کمپیوٹر کا دور ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز ایجاد ہے۔ لگتا ہے پوری دنیا ایک ڈبے میں سمٹ آئی ہو۔ کسی بھی قسم کی معلومات حاصل کرنا چاہیں، بحث مباحثہ میں حصہ لینا چاہیں، پیغام بھیجنا یا راستہ معلوم کرنا چاہیں۔ صرف بٹن دبانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کے لیے بھی نہ صرف معلوماتی بلکہ دماغی نشوونما اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بڑھانے والے گیمز ہیں۔

اس کے ساتھ نقصانات کی فہرست بھی طویل ہے۔ مسلسل استعمال سے خصوصاً بچوں میں جسمانی نقائص پیدا ہونے اور بینائی پر اثر پڑنے کے قوی امکانات ہیں۔ بچے اُن تجربات سے بھی محروم رہتے ہیں جو ان کی نشوونما کا اہم حصہ ہیں۔ مثلاً ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود، کتابوں کا مطالعہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ غلط ویب سائٹس اخلاقی اقدار و کردار پر بھی منفی اثرات ڈالتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نئی ایجادات فائدہ مند کم اور نقصان دہ زیادہ ثابت ہوتی ہیں۔

(16)

سوال: وادیٔ ہنزہ کی خوبصورتی اور ثقافت کو بیان کرنے کے لیے مصنف نے کن باتوں کا سہارا لیا ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔

بنیادی نکات:

☆ اندازِ تحریر، منظر نگاری۔

☆ ہنزہ کی مخصوص ثقافت۔

☆ جادوئی قدرتی حسن۔

دریائے ہنزہ کے پُل سے صرف ایک جیپ یا گاڑی گزر سکتی ہے۔ اسے پار کر کے ہی ہنزہ جایا جا سکتا ہے۔ یہ سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ پہاڑ بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ یہاں ماضی میں کافی حادثات واقع ہو چکے ہیں۔ کئی موڑ یہاں ایسے آتے ہیں جہاں سے مڑنے کے لیے گاڑی کو آگے پیچھے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے گرد حفاظتی پُشتے بھی موجود نہیں۔ یہ دنیا کی سب سے خطرناک سڑک سمجھی جاتی ہے۔ یہ تقریباً پچاس ہزار فٹ تک کی بلندی کا سفر طے کرتی ہے۔ اتنی بلندی سے نیچے جھانکیں تو دنیا کی بلند ترین چوٹیاں نظر آتی ہیں۔

وادی کے درمیان ندی بہتی ہے، جس کا پانی نہایت صاف، ٹھنڈا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ یہ وادی پھل دار درختوں سے بھری ہے۔ مرد اور عورت یہاں مضبوط جسامت کے ہوتے ہیں۔ یہاں لوگوں کی عمریں کافی لمبی ہوتی ہیں۔ لوگ بہت محنتی ہیں اور ذہنی پریشانیاں نہیں لیتے۔ سب لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں۔ بیٹے کی شادی پر اُس کا گھر باپ بناتا ہے اور اس کے ساتھ ہمسائے مل جل کر کام کرتے ہیں۔ کوئی مر جائے تو پورا ہفتہ سوگ منایا جاتا ہے۔ مرگ والے گھر کھانا نہیں بنتا، عزیز یا ہمسائے کھانا لاتے ہیں، غرضیکہ ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

بلتت نامی گاؤں سے گزرتے ہوئے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ملکہ وکٹوریہ کی یادگار ہے۔ یہ بارہ فٹ لمبی اور چوڑی ہے اور نو فٹ اونچی ہے۔ اسے پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ انگریزوں نے یہ علاقہ 1891ء میں فتح کیا تھا اور اس وقت ملکہ وکٹوریہ حکمران تھیں۔

وادی میں گلیشیئر کا پانی دیہاتوں، کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتا ہے۔ سردیوں میں یہاں خوب بارشیں ہوتی ہیں۔ گرمیوں میں لوگ گلیشیئر کے پانی پر انحصار کرتے ہیں جو کہ گرمی سے پگھلتا ہے۔ اس پانی میں بہت سی دھاتیں ہیں جن کی وجہ سے درختوں اور فصلوں کو کیڑا نہیں لگتا۔ یہاں کی فضا صاف اور آلودگی سے پاک ہے۔ بجلی اور گیس کا کوئی انتظام نہیں اس لیے لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں اور یہی ان کی صحت کا راز ہے۔ سونے سے پہلے کھانا نہیں کھاتے، سورج ڈوبتے وقت کھاتے ہیں۔ وہ شکر کا استعمال نہیں کرتے اور شہد سے کام چلاتے ہیں۔

(17)

سوال: ہمارا معاشرہ مرد کی بالادستی کا معاشرہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے عورت کے حقوق پر کس قدر زور دیا ہے؟ کیا ہم ان اسلامی احکامات کی پاسداری کرتے ہیں؟ مصنف کی تائید یا تردید میں دلائل دیں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ اسلام میں عورت کے حقوق۔

☆ عورت کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک۔

☆ عورت مشرق اور مغرب کی تہذیب میں۔

اسلام نے جتنا رتبہ اور حقوق عورت کو دیئے ہیں وہ آج تک کوئی دوسرا مذہب نہیں دے سکا۔ ہمارے معاشرے کے بنائے ہوئے رسم ورواج اور قاعدے قوانین نے یہ سارے حقوق پامال کر دیئے ہیں۔ عورت اپنی تابعداری اور وفاداری کے وصف کی وجہ سے محکومی کا شکار ہوگئی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جتنے بھی اسلامی ممالک ہیں وہاں عورتوں کی حالت غیر اسلامی ممالک کے مقابلے میں ابتر ہے۔

اسلام میں عورت کو تجارت، زراعت، لین دین، صنعت وحرفت، درس وتدریس، صحافت وحکومت غرض کہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی صلاحیت دکھانے اور فیصلہ کرنے کی پوری اجازت ہے لیکن مردوں نے اس کے سارے حقوق سلب کر کے اُس کی مرضی معلوم کیے بغیر تمام تر گھریلو ذمہ داریوں اور فرائض کا بوجھ اُس کے کندھوں پر ڈال دیا ہے۔ کئی اسلامی ممالک میں آج بھی عورت کی زندگی کے سارے فیصلے مرد حضرات ہی کرتے ہیں۔ باہر کام کرنے کی اجازت تو درکنار اُسے اپنا جیون ساتھی بھی چُننے کی آزادی نہیں۔ کئی علاقوں میں اس بات کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا کر عورت کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے جبکہ اسلام میں قتل گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے اور ہر کمزور فرد اور طبقے پر ہونے والا ظلم خدا کی نافرمانی میں شمار ہوتا ہے۔

بیشتر ملکوں میں آج بھی مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ جہاں بیٹوں کی پیدائش پر خوشی کی لہر دوڑتی ہے، وہاں بیٹیوں کی پیدائش رنگ میں بھنگ ڈال دیتی ہے۔ صرف اس لیے کہ لڑکا مستقبل کا سہارا سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بات اب غلط ثابت ہو چکی ہے۔ دیکھا جائے تو بیٹیاں ہر معاملے میں والدین پر اپنے آپ کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتی ہیں۔

پاکستان کے دردمند طبقے نے اس ناانصافی کے خلاف تحریک چلائی اور پاکستان کے چیف جسٹس میاں عبدالرشید مرحوم نے 1955ء میں ایک کمشن قائم کیا جس میں خواتین کے لیے نئی سفارشات پیش کی گئیں لیکن ان پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ بہرحال 1997ء تک عورتوں کے حقوق میں کافی مثبت تبدیلیاں آئیں۔

مغربی عورت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں زیادہ حقوق حاصل ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اگر آپ گہرائی میں جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اب تک مرد کا ہی راج ہے۔ باہر کام کرنے میں عورت کو مرد کی نسبت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے مگر تنخواہ کم ملتی ہے چاہے وہ مرد سے ذہنی طور پر زیادہ قابل ہی کیوں نہ ہو۔

---

(18)

سوال: اکیسویں صدی میں بھی لوگ توہم پرستی کا شکار ہیں۔ بعض روایات کے سامنے علم کی روشنی بھی ناکافی ہے۔ مصنف کی معلومات کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ اپنے تجربے سے بھی فائدہ اٹھائیں۔ (حدالفاظ 300-350)

بنیادی نکات:

☆مذہبی روایات اور تعلیم کا ٹکراؤ۔

☆حقیقت پسندی کا فقدان۔

☆اندازِ تحریر اور لب ولہجہ۔

کراچی سے چند کلومیٹر دور شمالی علاقے منگھوپیر میں سخی سلطان بابا کے مزار کے قریب ہی ایک تالاب ہے جہاں ہر سال مگرمچھوں کا میلہ منایا جاتا ہے۔ اس تالاب میں 100 سے اوپر مگرمچھ پائے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ مگرمچھ اُس زمانے کی یادگار ہیں جب دریائے سندھ یہاں سے گزرتا تھا۔ دوسری روایت کے مطابق یہ کسی بزرگ کی کرامت ہیں۔ اس علاقے کے لوگ انہیں خوشیوں اور خوشحالی کا ضامن سمجھتے ہیں۔ اس علاقے کے مکین جو "شیدی برادری" کے نام سے جانے جاتے ہیں، ہر سال اپنی برادری کی خوشی اور خوش نصیبی کے لیے ایک رنگا رنگ میلے کا اہتمام کرتے ہیں جس میں دور دور سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ شیدی برادری کے افراد بنیادی طور پر افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور غلاموں کی حیثیت سے مختلف ادوار میں یہاں آئے تھے۔ آج بھی افریقہ کے کچھ افراد مگرمچھوں کی پوجا کرتے ہیں اور اُن کی کھالیں پہن کر رقص کرتے ہیں۔

میلے کا سب سے اہم جز مگرمچھوں کے سردار کو گوشت اور حلوہ کھلانا ہے۔ سب سے عمر رسیدہ مگرمچھ کو سردار چُنا جاتا ہے اور اسے "مور صاحب" کا لقب دیا جاتا ہے۔ اُس کے سر پر سیندور اور عطر لگایا جاتا ہے اور گلاب کے پھولوں کا ہار ڈالا جاتا ہے۔ اس تقریب کے بعد لوگ ایک دوسرے کو گلے مل کر مبارکباد دیتے ہیں اور اجتماعی طور پر دعا مانگتے ہیں کہ اگلے سال تک کا عرصہ خوشحالی میں بسر ہو۔ اس تالاب کے تمام مگرمچھ بے ضرر ہوتے ہیں اور انسانوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے۔ یہ میلہ چار دنوں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں پر جلوس کے افراد دھمال ڈالتے ہیں۔ اس میلے میں پڑھی جانے والی دعائیں اور ان کی ادائیگی کا طریقہ شیدی برادری میں سینہ درسینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

سخی سلطان بابا کے مزار کے آس پاس کافی قدرتی چشمے پائے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ گرم اور کچھ سرد ہیں۔ انہیں لوگ شفا کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ میلے میں جانے والے لوگ پہلے گرم پانی کے چشمے پر غسل کرتے ہیں اور پھر سرد پر۔ اُن کے عقیدے کے مطابق نہانے والوں کو تمام جلدی بیماریوں اور جزام جیسے موذی مرض سے نجات مل جاتی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ان چشموں میں گندھک (سلفر) موجود ہے جو جلدی امراض کے لیے فائدہ مند ہے۔

(19)

سوال: کیلا مکمل غذا ہونے کے علاوہ طبعی لحاظ سے بھی بہت اہم ہے۔ مصنف کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیلے کے فوائد پر ایک جامع تنقیدی نوٹ لکھیں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ کیلے کی اہمیت۔

☆ مصنف کی جامع معلومات۔

☆ پاکستان میں کیلے کی کاشت اور استعمال۔

کیلا ایک ایسا پھل ہے جو دنیا کے ہر خطے میں یکساں مقبول ہے۔ اس کا درخت 8 سے 18 فٹ تک لمبا ہوتا ہے اور تنا دوسرے درختوں کی طرح لکڑی کی مانند سخت نہیں ہوتا۔ اس میں پتوں کے علاوہ کوئی شاخ نہیں ہوتی۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ بعض بڑے اور بعض چھوٹے ہوتے ہیں۔ بعض میں بیج ہوتے ہیں اور بعض میں بالکل نہیں ہوتے۔ رنگت میں کچھ پیلے، کچھ ہرے اور کچھ لال ہوتے ہیں۔ کیلا غذائیت سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس میں کیلشیم، میگنیزیم، فاسفورس، گندھک، فولاد اور آئیوڈین خاصی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں پروٹین اور چربی کم ہوتی ہے جبکہ نشاستہ کافی مقدار میں موجود ہوتا ہے جو جسم کو توانائی دیتا ہے۔

طبی لحاظ سے کیلا کئی خوبیوں کا حامل ہے اور کئی امراض کے لیے مفید ہے، خصوصاً پیچش کے لیے۔ اس کے درخت کے تمام حصے دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں مثلاً کیلے کی جڑ، پھلیاں اور پتے وغیرہ۔ کھانسی خواہ خشک ہو یا بلغمی، کہتے ہیں کہ اس کے خشک پتے کو جلا کر تھوڑا سا نمک ملا کر چاٹنے سے دور ہو جاتی ہے۔ قدیم زمانے سے خواتین رنگ کو نکھارنے اور داغ دھبے دور کرنے کے لیے اس کے گودے میں خربوزوں کے بیج پیس کر چہرے پر لیپ کرتی رہی ہیں۔

سانپ کے زہر کو زائل کرنے کے لیے پرانے زمانے میں حکیم درخت کے تنے کا رس نکال کر فوراً مریض کو پلا دیا کرتے تھے جس سے زہر کا اثر زائل ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ طبی علم کے مطابق سانپ کیلے کے درخت کے قریب نہیں جاتے سوائے ایک خاص قسم کے سانپ کے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں سانپ کا زہر ختم کرنے کا کوئی جز موجود ہے۔ آج کل کیلے کے درخت میں ایک ایسی بیماری پیدا ہو رہی ہے جس کا کوئی علاج نہیں اور یہ ڈر ہے کہ کہیں یہ پھل مستقبل میں ناپید نہ ہو جائے۔

(20)

سوال: الزبتھ بلیکویل نے طب کے شعبے میں خواتین کے داخلے کی راہ ہموار کی۔ الزبتھ بلیکویل کی کاوشوں اور معاشرے کے رویے پر ایک تنقیدی نوٹ لکھیں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔

☆ مصنف کا انداز تحریر۔

☆ لب ولہجہ۔

الزبتھ بلیکویل پہلی خاتون تھیں جنہوں نے امریکہ میں طب کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے عورتوں کے لیے طب کی تعلیم کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس پیشے کو اپنانے میں کافی عورتوں کی مدد کی۔ الزبتھ تاریخ اور طبیعات جیسے مضامین میں دلچسپی رکھتی تھیں۔ انہیں طب کے پیشے سے قطعاً لگاؤ نہیں تھا بلکہ جسم کے اعضا، بیماریوں اور چیر پھاڑ کے تصور سے بھی گھن آتی تھی۔ اس لیے انہوں نے درس اور تدریس کے شعبے کو اپنایا جو کہ اس وقت عورتوں کے لیے بہترین سمجھا جاتا تھا۔ ان کے میڈیکل کے شعبے میں جانے کی وجہ اُن کی قریبی دوست کے آخری الفاظ ''اگر میری فزیشن کوئی عورت ہوتی تو غالباً مجھے اتنی تکلیف نہ دیکھنی پڑتی۔'' نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور انہوں نے اس شعبے کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مختلف فزیشنوں سے مشورہ کیا۔ انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ ممکن نہیں۔ پہلی وجہ تو آسمان کو چھوتے ہوئے اخراجات اور دوسری وجہ عورتوں کا اس شعبے میں داخلہ ناقابل قبول تھا۔ انہوں نے اس بات کو چیلنج سمجھا اور بعد میں اُن ڈاکٹروں کو جو ان کے دوست تھے، اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک سال تک انہیں اپنے ساتھ طب پڑھنے کی اجازت دیں۔ ساتھ ہی انہوں نے نیو یارک اور فلاڈیلفیا کے تمام میڈیکل کالجوں میں درخواستیں دیں۔ آخر کار 1847ء میں جنیوا میڈیکل کالج نے یہ سمجھتے ہوئے کہ دوسرے طلبا کبھی بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی عورت اُن کے ساتھ پڑھے، مذاق کے طور پر ہاں کہہ دی، جس کا بعد میں اُنہیں پچھتاوا ہوا۔

دو سال بعد انہوں نے ایم ڈی کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد لندن اور پیرس کے کلینکوں میں کام کیا۔ بدقسمتی سے کسی مریض سے انہیں آنکھوں کی بیماری لگی اور ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ ان کے سرجن بننے کے خواب ادھورے رہ گئے اور وہ نیو یارک واپس لوٹ گئیں۔ وہاں انہوں نے پریکٹس قائم کی لیکن بہت کم مریض تھے اور دوسرے ڈاکٹر اُن سے گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے تھے جن سے انہیں تجربہ حاصل کرنے کی امید تھی۔ بعد میں دوستوں کی مدد سے اُنہوں نے ڈسپنسری کھولی جو کہ ایک کرائے کے کمرے میں تھی۔ تین سال بعد انہوں نے اپنی بہن ایملی اور ایک ڈاکٹر کے ساتھ نیو یارک انفرمری (Infirmary) کی بنیاد ڈالی جہاں خواتین ڈاکٹروں کی تعلیم کے علاوہ غریبوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔

(21)

سوال: قلوپطرہ کی ذہانت اور طرز حکمرانی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ عورت کسی بھی حوالے سے مرد سے کم نہیں۔ کیا آج بھی قلوپطرہ جیسی خواتین پائی جاتی ہیں۔ بحث کریں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ قلوپطرہ کا طرزِ حکمرانی۔

☆ عورت کی ذہانت۔

☆ عورت کی وفا اور محبت۔

قلوپطرہ کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ فلموں اور رومانی ناولوں نے اسے ایک حسین ملکہ کے روپ میں پیش کیا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شکل وصورت تو اُس کی معمولی تھی لیکن خداداد ذہانت اور علمی قابلیت نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ فلسفہ، ادب، موسیقی، مصوری اور طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُسے چھ زبانوں پر عبور بھی حاصل تھا۔ وہ اپنے اندازِ گفتگو سے دوسروں کا دل موہ لیتی تھی۔ حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اس کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دریائے نیل میں پانی کم ہونے کے باعث ملک کو قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی اس کے زوال کا سبب بنا۔ اُس کے بھائی نے جو مصر پر تنہا حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا، رعایا کو قلوپطرہ کے خلاف کر کے اُسے مصر چھوڑ کر شام جانے پر مجبور کر دیا۔

رومی حکمران سیزر نے مصر میں داخل ہوتے ہی قلوپطرہ اور اس کے بھائی کو حاضری کا حکم دیا۔ اس کا مقصد ان دونوں میں مصالحت کروانے کا تھا۔ قلوپطرہ کو بخوبی اندازہ تھا کہ اُس کا بھائی اس کو قتل کرنے کی پوری کوشش کرے گا، اس لیے اس نے خود کو ایک قالین میں لپیٹ کر اپنے آپ کو سیزر کے سامنے پیش کیا۔ جس انوکھے انداز سے وہ قالین میں سے نکلی اُسے دیکھ کر سیزر مسحور ہو گیا۔

قلوپطرہ کو جب سکون سے حکومت کرنے کا موقع ملا تو اُس نے اپنے رفاہی کاموں سے رعایا کا دل جیت لیا۔ کسانوں کے ٹیکس معاف کیے جس سے کاشت میں اضافہ اور ملک کی خوشحالی میں استحکام پیدا ہوا۔ عوام کا خلوص اور وفاداری حاصل کرنے کے لیے اس نے عوامی زبان میں گفتگو کو اپنایا۔ پہلے حکمران ایسا نہیں کر پائے۔

اپنے شوہر انٹونی کی موت کے بعد زندگی سے دلبرداشتہ ہو کر کئی دفعہ اُس نے خودکشی کی کوشش کی۔ آخر کار اس مقصد کے لیے اُس نے خود ایک زہریلے سانپ کا انتخاب کیا جو اُس کی موت کا سبب بنا۔

(22)

سوال: مصنف نے چاند بی بی کی صلاحیتوں کو کس طرح نمایاں کیا ہے؟ وضاحت کریں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ چاند بی بی کی دلیری۔

☆ طرزِ حکمرانی۔

☆ عورت ہونا کسی کام میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

☆ آستین کا سانپ۔

چاند بی بی دنیا کی مشہور عورتوں میں سے تھی۔ اپنی بہادری کی وجہ سے جانی جاتی ہے۔ اس کے بچپن کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی اُس نے اپنے باپ برہان شاہ اور چچا کو حکومت پر قبضے کے لیے لڑتے ہوئے دیکھا۔ برہان شاہ نے اکبر بادشاہ سے اس سلسلے میں مدد مانگی اور اکبر نے مدد کے لیے اپنی فوج بھیجی لیکن اس دوران چچا کا انتقال ہو گیا اور تخت و تاج برہان شاہ کے ہاتھ آ گیا۔ برہان شاہ نے اقتدار حاصل ہونے پر اکبر بادشاہ کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ احمد نگر کا چوتھا بادشاہ تھا اور کافی عمر رسیدہ تھا، اس لیے کچھ عرصے بعد چل بسا اور اس طرح اقتدار چاند بی بی کے ہاتھ آ گیا۔

احمد نگر ہندوستان کے جنوبی علاقے میں ہے۔ اس کی بنیاد عادل شاہ نے رکھی تھی، اس لیے لوگ اسے عادل شاہی سلطنت بھی کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ اُن دنوں اپنی سلطنت بڑھانا چاہتا تھا اور دکن فتح کرنا چاہتا تھا جو کہ احمد نگر کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ وہ چاند بی بی کے باپ دادا کی سلطنت پر قبضہ کر کے شاہی خاندانوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ چاند بی بی کے خاندان میں صرف عورتیں اور بچے تھے، لہٰذا اُس نے اکیلے ہی مغلِ اعظم کی فوج سے ٹکر لینے کی ٹھانی۔ اس نے اکبر کی فوج کو بار بار شکست دی اور بڑی دلیری سے لڑی۔ وہ ایک پردہ دار خاتون تھی اور کبھی بھی محل سے باہر پردے کے بغیر نہیں نکلی۔ اُس نے لڑائی بھی برقع اوڑھے میدانِ جنگ میں تلوار سنبھال کر کی اور محل میں عیاشی کے بجائے زرہ بکتر پہن کر دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

اس کی دلیری، ہمت، لگن اور محنت کو دیکھ کر نہ صرف مرد بلکہ عورتیں اور بچے بھی رات بھر مورچوں پر اُس کے ساتھ ڈٹے رہتے۔ اس کا پھاٹک رات دن کھلا رہتا تھا تاکہ فریاد لے کر کوئی آئے تو خادمہ اُسے فوراً جگا دے۔ اسے اپنی رعایا پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ رعایا کے لیے ہر دم مرنے کے لیے تیار تھی۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نگر کی فوج کے کچھ سپاہی محل کے کھلے دروازے کے اندر گھس آئے اور اسے قتل کر دیا۔ وہ چاند بی بی جسے اکبر کی فوج شکست نہ دے سکی اُس کی جان اپنی رعایا کے لوگوں نے ہی لے لی۔

(23)

سوال: مشرقی تہذیب میں شادی کئی مراحل طے کرنے کے بعد انجام پاتی ہے۔ اس نظام کے فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ کیا آپ اس نظام کے حق میں ہیں؟ دلائل سے ثابت کریں۔ جہاں تک ممکن ہو مصنف کی معلومات سے فائدہ اٹھائیں۔ (حدالفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ مشرقی طرزِ معاشرت کی اہمیت۔

☆ عصرِ حاضر میں اس کے فوائد اور نقصانات۔

☆ زبان و بیان (ذخیرہ الفاظ اور زبان کا معیار)

طے شدہ شادیوں کی ریت ابھی تک چلی آ رہی ہے جس میں خاندان کے لوگ لڑکی یا لڑکے کا انتخاب کرتے ہیں۔ مغربی ممالک میں یہ شاید عجیب بات سمجھی جائے لیکن انڈیا میں اسے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ شادی زندگی کا ایک بہت اہم فیصلہ ہے، اس لیے اس کے لیے بہت پلاننگ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ بیشتر ہندو طلاق پر یقین نہیں رکھتے۔ ایک نوجوان لڑکے یا لڑکی کے لیے زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ خود کرنا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے گھر والے ایک مناسب ساتھی کی تلاش کرتے ہیں۔ اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ دونوں کی تعلیم، تہذیب، کھانے پینے اور مذہب وغیرہ میں ہم آہنگی ہو اور یہ کہ دونوں کے والدین بھی نزدیک ہی رہائش رکھتے ہوں۔

لڑکے کے بارے میں کافی چھان بین کی جاتی ہے مثلاً کیا وہ بیوی کا خرچہ اُٹھا سکتا ہے، کیا وہ اچھا شوہر اور باپ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیا وہ بیوی کو علیحدہ رکھے گا یا کہ فیملی کے ساتھ؟ اگر فیملی میں رہنا ہو تو کیا گھر کی خواتین کی دیکھ بھال صحیح چل رہی ہے؟ کیا گھر ضرورت کے مطابق ہے؟ سب سے اہم یہ کہ خاندان کی عزت باہر کے لوگوں کی نظروں میں کیسی ہے؟

لڑکی کے بھی طور طریقے اور سلیقے کے بارے میں پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ اس کے بعد تصاویر کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پسند آنے پر والدین سے بچوں کی ملاقات کرواتے ہیں۔ زمانہ چونکہ اب بدل رہا ہے اس لیے اب کافی گھرانے لڑکے لڑکی کی ملاقاتیں کراتے ہیں۔ عام طور پر یہ گھر والوں کی نگرانی میں ہوتی ہیں۔

افسوس کہ ابھی بھی کچھ زبردستی کی شادیاں جاری ہیں اور ایسی بھی جن میں کمسن لڑکیوں کو بوڑھوں سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے یا ہونے میں ابھی بھی جہیز جیسی لعنت کا بڑا عمل دخل ہے۔ جہیز لڑکی والے دیتے ہیں یا اُن سے مانگا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ برے وقت کی ضمانت ہے۔ لڑکیوں کے والدین تاعمر بچیوں کے لیے پیسا اکٹھے کرتے رہتے ہیں تاکہ ان کی بیٹی کو سسرال میں تنگی نہ ہو یا طعنے نہ سننے پڑیں۔ لڑکے والے اسے اپنا حق سمجھ کر لیتے ہیں۔ یہ لعنت کچھ حد تک کم ہو چکی ہے لیکن ابھی بھی بڑے پیمانے پر اس کا لین دین جاری ہے۔

(24)

سوال: میڈیا نوجوان نسل کی اخلاقیات پر کس قدر اثر انداز ہو رہا ہے، منفی اور مثبت پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیں۔ آپ مصنف کی معلومات کے علاوہ ذاتی معلومات اور تجربات کا ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ (حد الفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ ٹی وی، کمپیوٹر اور بجلی کے دیگر آلات کا نوجوانوں کی زندگی میں کردار۔

☆ والدین کی ذمہ داری۔

☆ میڈیا کی حدود و قیود۔

☆ لب و لہجہ، اندازِ تحریر۔

ٹیلی ویژن ایک مفید ایجاد ہے لیکن اس کے کئی پروگرام بچوں کی ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں مصروف ہونے پر وہ آپس کے لڑائی جھگڑوں سے نجات پاتے ہیں۔ بچوں کا شور ان کے کام میں دخل انداز ہوتا ہے اور کھیل کود کے درمیان بچوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ بچوں کو ٹی وی پروگراموں میں مصروف رکھا جاتا ہے جو نہ صرف بچوں کی شخصیت بگاڑتے ہیں بلکہ زندگی کے لیے بہت بڑا خطرہ بھی ہیں۔

کم عمری میں ہی ان کو سنوارا جا سکتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ ہاتھ ماں باپ کا ہوتا ہے۔ ماہر سماجیات کا کہنا ہے کہ بچے کو اچھے طور طریقے سکھانے میں والدین کے بعد عزیزوں، ہمسایوں، اساتذہ اور دوستوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ میڈیا سب سے آخر میں آتا ہے لیکن والدین کو ضروریات نے اپنا اس قدر غلام بنا لیا ہے کہ بچوں کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔ والدین سے رابطہ کم ہونے کی صورت میں وہ ٹی وی کا سہارا لیتے ہیں۔ ٹی وی پر معلوماتی کم اور تشدد آمیز پروگرام زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ کارٹون جیسے پروگراموں میں بھی تشدد اور مار پیٹ دکھائی جاتی ہے۔ انہیں دیکھ کر بچے کو ہر مسئلے کا حل تشدد ہی نظر آتا ہے۔

پاکستانی چینل بھی اب مغربی چینلوں کی تقلید میں منفی کرداروں کی کامیابی دکھاتے ہیں۔ اس سے جارحیت پروان چڑھتی ہے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں پر شفقت، ہمدردی، عاجزی اور صبر جیسی اقدار بے معنی لگتی ہیں۔ بچوں کو ٹی وی سے روکنا نہیں چاہیے کیونکہ جس کام سے انہیں منع کیا جائے وہ وہی کرتے ہیں۔ ٹی وی دیکھنے کا وقت متعین ہونا چاہیے۔ بیڈ روم سے ٹی وی ہٹا لینا چاہیے۔ ان کے ساتھ خود بیٹھ کر معلوماتی پروگرام دیکھیں اور بچوں کو معلوماتی کہانیاں پڑھنے کی عادت ڈالیں۔

---

(25)

سوال: خوشامد اخلاقی برائی کے ساتھ ساتھ مذہبی جرم بھی ہے۔ کیا اس لعنت سے چھٹکارا ممکن ہے؟ آپ اس برائی کو ختم کرنے کے لیے کیا تجاویز دیں گے۔ مصنف کی معلومات کے علاوہ ذاتی معلومات اور تجربات کی روشنی میں بات کریں۔ (حد الفاظ300-350)

بنیادی نکات:

☆ خوشامد کی ضرورت۔

☆ جھوٹ زندگی کا حصہ۔

☆ ذاتی مفاد اور لالچ۔

☆ لب ولہجہ، اندازِ بیان۔

خوشامد پسندی بہت بڑی علت اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ خوشامد اور خوشامد پسند دونوں ہی اخلاقی کمزوری کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا کردار سنوارنے کے بجائے بگاڑتی ہے اور خود میں اصلاح کی صلاحیت ختم کرتی ہے اور اس سے نالائقی اور کم ظرفی پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنی تعریف سن کر اسے سچ سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ بات اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

خوشامد پسندی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم میں وہ اچھائیاں نہیں ہوتیں جن کی ہمیں چاہ ہوتی ہے۔ ہم لاشعوری طور پر ان اچھائیوں کی تمنا رکھتے ہیں جو ہم میں نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں جب خوشامدی حضرات ہمیں یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں تو ہم اپنی جھوٹی تعریف سن کر بے حد مسرور ہوتے ہیں حلانکہ ہم صحیح معنوں میں اُن تعریفوں کے لائق نہیں ہوئے۔ البتہ کسی اچھے انسان کی حقیقی اچھائیوں کی تعریف ضرور کرنی چاہیے۔ اس سے اُس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور تعریف کرنے والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک اچھے دوست کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ نہ صرف آپ کی خوبیوں بلکہ خامیوں سے بھی آگاہ کرے۔

کئی حضرات دوسروں کی امارت، دھن دولت، شہرت اور رتبے سے متاثر ہو کر خوشامدانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کبھی تو وہ عادت سے مجبور ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ذاتی مفاد کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ وہ کام بن جائے جس کے وہ اہل نہیں۔ ایسی صورت میں حقدار کی حق تلفی ہوتی ہے۔

---

(26)

سوال: لاہور تاریخی لحاظ سے اہم ہونے کے ساتھ ثقافتی مرکز بھی رہا ہے۔ کیا دورِ حاضر میں نوجوان نسل اس ورثے کی حفاظت کر رہی ہے؟ اس کے ثقافتی تہواروں خاص کر کے بسنت کے منفی اور مثبت پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ تحریر کریں۔ معلومات کے علاوہ ذاتی تجربات کا ذکر بھی کریں۔

<u>بنیادی نکات:</u>

☆ لاہور کی تاریخی اہمیت۔

☆ ثقافتی اور ادبی مرکز۔

☆ مصنف کا نقطۂ نظر اور لب ولہجہ۔

دریائے راوی کے مشرقی کنارے پر واقع لاہور پاکستان کا ایک قدیم، تاریخی اور خوبصورت شہر ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہاں اسلامی حکومت وجود میں آئی اور شہر نہ صرف اسلامی تہذیب وثقافت بلکہ تجارت اور صنعت وحرفت کا مرکز بھی قرار پایا۔ مغلیہ حکومت نے پھر سے اُس کی ثقافت، تہذیب وتمدن اور علوم لطیفہ کو فروغ دیا۔ دنیائے ادب کے نامور ستاروں کو جمع کر کے اس میں چار چاند لگا دیے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر لاہور کو آج نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

مغلیہ حکومت کی شان وشوکت کے آثار آج بھی لاہور کی سرزمین پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اس دور کی قدیم عمارات مثلاً شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، نور جہاں اور آصف جاہ کے مقبرے اور شالامار باغ نہ صرف سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہیں بلکہ لاہور کی تاریخی اہمیت کے آئینہ دار ہیں۔ وزیر خان مسجد عربی نقاشی اور فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کا شمار آج بھی جنوبی ایشیا کی خوبصورت ترین عمارات میں ہوتا ہے۔ شالامار باغ کے حسین سبزہ زار، فواروں سے اچھلتا، جھملاتا صاف شفاف پانی اور حسین بارہ داری ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ حضوری باغ سے متصل مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے ہمراہ اس کی چار بیویوں کی راکھ بھی اس میں دفن ہے۔

لاہور زندگی کی رنگینیوں سے بھرپور ہے۔ فوڈ اسٹریٹ اور طرح طرح کے ریسٹورنٹ میں رات گئے تک کھانے پینے کے دور اور فورٹریس اسٹیڈیم میں لیٹ شاپنگ عجیب سماں پیش کرتے ہیں۔ لاہور اس چہل پہل کے علاوہ اپنے تہواروں سے بھی ہر شخص کے لیے تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرتا ہے۔ بسنت ان تہواروں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ موسم بہار کی آمد کی خوشخبری لاتا ہے۔ آسمان پتنگوں سے بھرا نظر آتا ہے۔ ہر طرف ''بوکاٹا'' کا شور اور ڈھولوں کی آواز عجیب گہما گہمی کا سماں پیدا کرتی ہے۔ اس موقع پر اب پیلے کپڑے پہننے کا رواج زور پکڑ رہا ہے۔ بسنت سے منسوب خطروں مثلاً پتنگیں لوٹتے ہوئے چھتوں سے گرنا اور ڈور سے گلہ کٹنا وغیرہ کے باوجود یہ تہوار بہت مقبول ہو رہا ہے۔

(27)

سوال: زندہ قومیں وطن کی محبت سے سرشار ہوتی ہیں۔ مگر یہ محبت اعتدال میں نہ رہے تو تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ جس طرح آج کچھ قومیں اسی بے اعتدالی کا شکار ہیں۔ ایک سچا پاکستانی ہونے کے ناطے کیا ہم حبِ وطن کے جذبے سے سرشار ہیں؟ اگر نہیں تو اس کی کیا وجوہات ہیں؟ اپنی رائے کے حق میں دلائل دیں۔ مصنف کے نظریات کے علاوہ ذاتی تجربات اور خیالات کا ذکر بھی کریں۔ (حد الفاظ 300-350)

بنیادی نکات:

☆ جذبۂ حبِ وطن

☆ اپنا وطن اپنی پہچان

☆ ذخیرہ الفاظ اور زبان کا معیار

جس سرزمین میں انسان پیدا ہوتا ہے، اپنی زندگی کے شب و روز گزارتا ہے، جہاں کسی شخص کے عزیز و اقارب بستے ہیں، جہاں اس کی پسندیدہ اور محبوب چیزیں ہوتی ہیں اور جہاں اس کا دل لگا ہوتا ہے، وہ سرزمین اس کا وطن کہلاتی ہے۔

انسانی محبت کی بیسیوں صورتیں ہیں۔ ان میں وطن کی محبت کا جذبہ ہمیشہ سے باوقار سمجھا گیا ہے۔ اس جذبے کے زیرِ اثر انسانوں نے ہزاروں دفعہ اپنی جان پر کھیل کر وطن کو دشمنوں سے بچایا ہے۔ جو لوگ وطن کی محبت سے عاری ہوتے ہیں یا وطن سے غداری کرتے ہیں انہیں کبھی اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا گیا بلکہ دلوں میں ان کے خلاف ہمیشہ نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ وطن کی خاطر قربانیاں دیتے ہیں، ان کی یادگاریں تعمیر کی جاتی ہیں اور ان کا نام زندہ رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے تاکہ یہ مقدس جذبہ ہر کسی کی نظر میں قابلِ احترام سمجھا جائے۔ اسی جذبے کے زیرِ اثر زندہ قوموں کے افراد اپنے وطن کی چیزوں کو دوسرے ملک کی چیزوں کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں اور انہیں اپنے وطن کی ہر چیز سے عقیدت اور محبت ہوتی ہے۔

حب الوطنی کا جذبہ اگر غلط رنگ اختیار کر جائے تو خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔ جب انسان مختلف وطنوں کی صورت میں تقسیم ہو جاتے ہیں تو ایک ملک کے باشندے دوسرے ملکوں کے باشندوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز ذریعہ اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتے ہیں، اس وقت ان میں انسان دوستی کا جذبہ مفقود ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ درندوں سے بھی بدتر حرکات پر اتر آتا ہے۔

ہر مسلمان کے لیے اپنے وطن سے محبت کرنا ضروری ہے لیکن اسے بت بنا کر اس کی پوجا نہیں کرنی چاہیے۔ مغربی طرز کی حب الوطنی اختیار کرنے سے اسلامی بھائی چارے کی جڑیں کٹ جاتی ہیں اور مخلوق خداداد اقوام میں بٹ کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس جذبے کی شدت طاقتور قوموں کو کمزور قوموں کے مٹانے پر اُکساتی ہے اور دنیا بدامنی کا میدان بن جاتی ہے۔ یہ جذبہ اعتدال پر رہے تو انسانیت کو جنم دیتا ہے۔

(28)

سوال: لسی ایک روایتی مشروب ہے جو مزیدار ہونے کے ساتھ صحت کا بھی ضامن ہے۔ مصنف نے اس مشروب کی اہمیت کس طرح واضح کی ہے۔ دلائل دیں۔ نیز یہ بھی بتائیں کہ جدید مشروبات (کوک وغیرہ) کس حد تک نقصان دہ ہیں۔ لسی اور جدید مشروبات کے فائدے اور نقصان پر ایک مفصل تنقیدی نوٹ لکھیں۔

<u>بنیادی نکات:</u>

☆لسی کی روایت اور اہمیت۔

☆جدید نسل کا رویہ۔

☆ذخیرۂ الفاظ اور معلومات۔

اب سے کچھ عرصہ قبل تک پاکستان کے پسندیدہ مشروبات میں لسی کا نام سرفہرست ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کی جگہ کافی، چائے اور کوکا کولا جیسی چیزوں نے لے لی ہے۔ جس زمانے میں لسی کا استعمال عام اور رہن سہن سادہ تھا لوگ دراز قد، صحت منداور توانا ہوا کرتے تھے۔ اب جسم سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ توانائی اور صحت کی جگہ جسمانی کمزوری نے اور دراز قامتی کی جگہ کوتاہ قامتی نے لے لی ہے۔

لسی نہ صرف فرحت بخش مشروب ہے بلکہ ایک ایسی غذا ہے جو صحت و توانائی کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ دودھ کو بلو کر تیار کی جاتی ہے۔ اسے چھاچھ بھی کہتے ہیں۔ یہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مکھن نکالی ہوئی اور دوسری مکھن کے ساتھ۔ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یونانی طبیب اس کو جگر، معدہ اور خون کی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بکثرت استعمال کرتے تھے۔ یورپ کے سائنس دانوں کی تحقیقات کے مطابق لسی پینے والے پیٹ اور آنتوں کی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آنتوں کے اکثر جراثیم جو بڑھ کر مہلک ثابت ہو سکتے ہیں، لسی ان کی بڑھتی ہوئی تعداد پر قابو پا کر ان سے محفوظ رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لمبی عمر کا انحصار جہاں پھل، سبزیوں، جسمانی مشقت اور سادہ رہن سہن پر ہے، وہاں لسی کا بھی اتنا ہی عمل دخل ہے۔

صوبہ پنجاب سے تعلق رکھنے والے اپنی جسامت، تندرستی، توانائی اور لمبی عمر کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں شہرت رکھتے ہیں۔ چند سال قبل پاکستان کے لوگوں کی تندرستی اور عمر کا ان کی غذا کے اثرات پر جائزہ لینے ایک وفد یورپ سے پاکستان آیا تھا۔ تحقیقات کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لسی کا استعمال صحت کو اچھا رکھنے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کی تیزابی خصوصیات دماغی قوت بڑھانے، اعصاب کو مضبوط رکھنے اور بالوں کو قبل از وقت سفید ہونے سے روکتی ہیں۔

(29)

سوال: سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ دورانِ سفر انسان نئے نئے تجربات سے گزرتا ہے۔ مصنف نے سفر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے کن عوامل کا سہارا لیا ہے؟ دلائل سے واضح کریں۔ نیز آپ نے اگر کوئی بین الاقوامی سفر کیا ہے تو اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔

بنیادی نکات:

☆ سفر وسیلہ ظفر۔

☆ سنجیدہ تجربات، مصنف کے تجربات، اپنے تجربات۔

اگر سفر کی تکالیف کو مدِنظر رکھا جائے تو یہ دوزخ ہے لیکن اس کے فوائد پر نگاہ دوڑائی جائے تو یہ کامیابی و فتح کا ایک وسیلہ نظر آتا ہے۔ سیر و سیاحت سے انسانی عقل اور سوجھ بوجھ میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعے انسان بہت سا علم اور تجربہ حاصل کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فوائد کے مقابلے میں انسان اپنی تکالیف کو بھول جاتا ہے۔

گھر سے دوری اور عزیز و اقارب کی جدائی اور مالی نقصان کا خوف بھی رہتا ہے۔ بعض اوقات نہایت بدمزاج اور غیر مہذب لوگوں سے بھی پالا پڑتا ہے۔ موسم کی شدت بھی گوارا کرنی پڑتی ہے۔ بڑے خطرناک راستوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں ایسی مشکلات ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج کل سفر بہت آسان ہو گیا ہے۔ سفر کے بہت سے فوائد ہیں۔ اس سے انسانی قوت ارادی میں استقلال پیدا ہوتا ہے اور محنت و مشقت کی عادت پڑتی ہے۔ تجربہ وسیع ہوتا ہے، مختلف اقوام اور ممالک کے تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ غیر ممالک میں مختلف مذاہب کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے، مختلف قسم کے افراد سے تبادلہ خیالات کا موقع ملتا ہے۔ یہی تجربات ملکی اور قومی ترقی کا موجب ہوتے ہیں۔ سیر و سیاحت انسان کی بہترین معلومات فراہم کرتی ہے۔ ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے وفد بھیجے جاتے ہیں جو اس ملک کی صنعت و حرفت کی ترقی اور معاشی بہبود کی سکیموں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اپنے ملک میں آ کر انہی سکیموں پر عمل درآمد کرتے ہیں۔

سیاحت اور سفر کی بدولت ہمارے تجربات اور مشاہدات میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ہمیں دوسرے ملکوں کی اصلی صورتحال کا پتہ چلتا ہے۔ سفر سے انسان کو بے شمار فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ سفر سے انسان کی عزت بڑھتی ہے۔ اگر وہ صاحب کمال ہے تو گھر سے باہر نکل کر اس کے جوہر اور بھی کھلتے ہیں اور اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ موتی جب تک سیپ میں اور ہیرا جب تک کان میں بند رہتا ہے، اس کی کچھ بھی قدر نہیں ہوتی لیکن جب وہ جوہری کی دکان میں آتا ہے تو قدر شناس اس کی خریداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

عزت اُسے ملی جو وطن سے نکل گیا — وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا

یہ سفر کرنے کی برکت ہے جو انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرتی ہے اور سماج میں اُس اُسے عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں خود اعتمادی اور مستقل مزاجی پیدا ہوتی ہے۔

(30)

سوال: دورِ جدید میں دیہات میں بھی خالص اشیائے خورد ونوش دستیاب نہیں مگر اس کے باوجود دیہات کے لوگ کئی شہری خباثتوں سے بچے ہوئے ہیں۔شہری اور دیہاتی زندگی کا فرق مثالوں سے واضح کریں۔مصنف کے نظریات کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔

بنیادی نکات:

☆شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق۔

☆ایک جگہ کی خوبی دوسری کی خامی۔

☆اپنی رائے،ذخیرہ الفاظ اور اندازِ تحریر۔

قدرت کی بعض نعمتیں ایسی ہیں جو اہلِ دیہات کے لیے مخصوص ہیں اور وہ شہروں میں بسنے والے لوگوں کے حصے میں نہیں آئیں۔شہروں میں انسان اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتا ہے۔شہری ماحول انسان کو مجلسی آداب واطوار سکھاتا ہے۔یہاں انسان کو مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کی سوسائٹی مل سکتی ہے۔ضروریاتِ زندگی آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔اگر کوئی بیمار ہو جائے تو بروقت طبی امداد حاصل کر سکتا ہے۔شہر میں انسان دورِ جدید کی ترقی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ذرائع آمد ورفت عام ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکتا ہے۔کاروبار،ملازمت،صنعت وحرفت کے بیشتر مواقع شہروں ہی میں ملتے ہیں۔ڈاک خانے،ہسپتال،اسکول،کالج،سینما،تھانہ،کچہری،اسٹیشن،بینک،بازار یہ سب چیزیں شہروں ہی میں پائی جاتی ہیں۔

شہری زندگی کا تاریک پہلو یہ ہے کہ یہاں خالص غذا اور صاف ستھری ہوا میسر نہیں آتی۔دودھ،گھی،آٹا وغیرہ تمام اشیائے خوردنی میں ملاوٹ پائی جاتی ہے۔لوگ زیادہ تر تنگ وتاریک کوچوں اور بند گلیوں میں رہتے ہیں۔بعض مکانوں میں تازہ ہوا اور دھوپ کا گزر تک نہیں ہوتا جس کے نتیجے میں شہری لوگوں کی صحت دیہاتی لوگوں کی نسبت بہت کمزور ہوتی ہے۔شہروں کے لوگ بالعموم پُرتکلف اور مصنوعی قسم کی زندگی گزارتے ہیں۔

دوسری طرف دیہات کے لوگ تہذیبِ جدید کی برکتوں سے محروم رہتے ہیں۔انہیں وہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں جو شہر والوں کو حاصل ہیں۔اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس کی طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔دور دراز کے دیہات میں آمد ورفت کی بہت دشواریاں پائی جاتی ہیں۔یہ لوگ اپنے بچوں کو خاطر خواہ تعلیم نہیں دلا سکتے۔دیہات میں روزگار کے مواقع بہت کم پائے جاتے ہیں۔

(31)

سوال: انسان نے اگر ستاروں پر کمندیں ڈالی ہیں تو صرف علم کی بدولت۔ تعلیم نے انسانی زندگی کو جس قدر پرآسائش بنایا ہے مثالوں سے واضح کریں۔ مصنف نے اپنے موقف کو کس طرح واضح کیا ہے۔

بنیادی نکات:

☆علم کی روشنی۔

☆انسانی ترقی کے مراحل۔

☆اندازِ بیان، لب ولہجہ۔

علم ہی کی برکت ہے کہ آج ہم ہواؤں میں اُڑ سکتے ہیں۔ آگ کے شعلوں میں محفوظ رہ سکتے ہیں اور سمندر کی سطح کے نیچے سفر کر سکتے ہیں۔ یہ اسی علم کا کرشمہ ہے کہ آج انسان خلا کی وسعتوں پر حاوی ہے اور وہی مظاہر فطرت جن کو کبھی وہ دیوتا سمجھ کر پوجتا تھا، آج اس کی خاکِ راہ کے ذرے ہیں۔

انسان نے علم سے کام لے کر اپنے آرام وآسائش کے لیے سیکڑوں سامان پیدا کیے ہیں۔ اس نے ایسی شاندار عمارات تعمیر کی ہیں جو رفعت میں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ انسان نے سفر کی تکلیف ختم کرنے کے لیے علم کی بدولت ریل گاڑی بنائی۔ پھر اس نے موٹر کار اور ہوائی جہاز بنائے اور جیٹ طیاروں اور راکٹوں تک میں سفر کیا۔ ٹیلی فون اور ریڈیو سے وائرلیس اور ٹیلیویژن تک، ٹائپ رائٹر سے لے کر چھاپہ خانے اور ٹیلی پرنٹر تک، خوردبین اور دوربینوں سے لے کر رصدگاہوں کے وسیع نظام تک ایجادات اور انکشافات کا ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جو علم اور صرف علم کی بدولت وجود میں آیا ہے۔

علم ہی کی بدولت یہ کمزور اور بے بس انسان جو بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے سہم جاتا تھا، آج بجلی کو اپنے قابو میں لا چکا ہے۔ بجلی اس کے گھر کی ایک ادنیٰ کنیز بن گئی ہے جو اس کے ایک معمولی اشارے پر ہر خدمت کے لیے حاضر ہے۔ وہ اس کے کارخانے چلاتی، اس کے گھر کو بقعہ نور بناتی، اس کا کھانا پکاتی، اس کا لباس تیار کرتی، اسے گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتی اور اس کی تفریح کے سیکڑوں سامان مہیا کرتی ہے۔ یہ علم ہی کی برکت ہے کہ انسان نے زمین کے نیچے دبے ہوئے قدرتی دفینوں کو نکالا اور انہیں حسب ضرورت استعمال کیا۔ علم ہی کی برکت سے انسان نے سورج، چاند اور ستاروں کی بناوٹ اور بلندی معلوم کی۔

علم ایک نور ہے جس سے جہالت اور گمراہی کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ علم سے انسان کی چشم بصیرت روشن ہو جاتی ہے جس سے وہ نیکی اور بدی، حق اور باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ علم ایک ایسا خزانہ ہے جسے کوئی چور چُرا نہیں سکتا اور جسے

جتنا زیادہ خرچ کیا جائے اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔علم ایک ایسا جوہر بیش بہا ہے جو عقل کے لیے صیقل کا کام دیتا ہے۔علم سے اطوار شائستہ اور اخلاق پاکیزہ بن جاتے ہیں۔وہ دل و دماغ کو جہالت کے مہیب اندھیرے سے نکال کر اس عالم میں پہنچاتا ہے جہاں حسد و بغض، دشمنی اور عداوت، حرص اور لالچ کا گزر نہیں ہوتا۔یہ علم ہی کی برکت ہے جو انسان کو ایک مکمل انسان بنا دیتا ہے جس کے بل بوتے پر معاشرے میں ہر کوئی شخص بہرہ ور ہو کر زندگی کی معراج حاصل کر کے اسے پُروقار اور متوازن بنا سکتا ہے۔

(32)

سوال: گداگری سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے؟ لوگ گداگری کے لیے کیا کیا بہروپ اختیار کرتے ہیں؟ مثالوں سے واضح کریں۔

بنیادی نکات:

☆ گداگری معاشرے پر بوجھ۔

☆ گداگری سے چھٹکارے کے اقدامات۔

☆ اسلامی احکامات۔

کسی سے کچھ مانگنا اور اس کے عوض اس کی جائز خدمت نہ کرنا گداگری کہلاتا ہے۔ گداگری کی سیکڑوں صورتیں ہیں اور گداگروں کے بیسیوں طبقے ہیں۔ کوئی فریاد کر کے مانگتا پھرتا ہے، کوئی گانا بجا کر تو کوئی پردیسی ہونے کا ڈھونگ رچا کر پیسے بٹورتا ہے۔ اکثر مسجد یا مدرسہ کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا بہانہ بنا کر دروازے کھٹکھٹاتے ہیں اور جو ملتا ہے لے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ الغرض ہر گداگر نے اپنی سمجھ اور اہلیت کے مطابق کوئی نہ کوئی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان مانگنے والوں میں بعض پیشہ ور ہوتے ہیں اور بعض مجبور۔ حالات کی ستم ظریفی کبھی کبھی بڑے بڑے خودداروں کو بھی ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جو لوگ جسمانی یا دماغی طور پر روزی کمانے کے قابل نہ ہوں یا جنھیں ایسے ذرائع دستیاب نہ ہو سکتے ہوں کہ وہ پیٹ کا دوزخ بھر سکیں، انہیں معذور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں کا اتنا قصور نہیں ہوتا جتنا کہ اس ماحول اور معاشرے کا ہوتا ہے جو انہیں گداگر بننے پر مجبور کر دیتا ہے اور ان کی مناسب امداد اور دستگیری نہیں کرتا۔ حکومت اس صورت میں قصوروار کہلاتی ہے جب وہ محتاج خانے نہیں کھولتی یا بیمار لوگوں کے لیے روزگار مہیا نہیں کرتی۔ ان کے اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی مدد کریں۔ مذہب اسلام نے ایسے ہی افراد کی امداد کے لیے زکوٰۃ کا اہتمام کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ اپنی حلال کی کمائی سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر دیا کرو۔

جو لوگ گداگری کو تن آسانی کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں یا جنھیں یہ پیشہ وراثت کے طور پر ملتا ہے، اور وہ جسمانی اور دماغی طور پر اس قابل ہوتے ہیں کہ کام کر کے روٹی کما سکیں، ان کی مدد کرنا گداگری کو پھیلانے کے مترادف ہے۔ تاہم ایسے لوگوں کے ساتھ بھی بات کرتے وقت یا انکار کرتے وقت نرمی سے کام لینا چاہیے اور انہیں مناسب دلائل کے ساتھ اس قبیح فعل سے روکنا چاہیے۔

گداگروں کی بڑھتی ہوئی تعداد ملک اور قوم کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔ دوسروں کی محنت سے کمائی ہوئی آمدنی میں سے مفت حصہ پا کر اکثر گداگر عیاشی کرتے ہیں۔ طرح طرح کے نشوں میں مبتلا ہوتے ہیں اور کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے بلکہ قوم کے افراد کے لیے ایک مستقل اور ناقابلِ برداشت بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں۔

یقل کا کام دیتا ہے۔ علم سے
ے نکال کر اس عالم میں پہنچاتا
جو انسان کو ایک مکمل انسان بنا
کے اسے پُروقار اور متوازن بنا

(33)

سوال: مچھر اور مچھر سے پھیلنے والی بیماریاں انسان کے لیے بے حد خطرناک ہیں۔ پاکستان میں مچھر کے پھیلنے کی کیا وجوہات ہیں؟ دلائل سے واضح کریں۔ مصنف کے نظریات کے علاوہ دیگر تجزیات کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ڈینگی بخار وغیرہ۔ (حدالفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ مچھر کی افزائش۔

☆ موسمی اثرات۔

☆ سہولیات کا فقدان۔

☆ ذاتی تجربات۔

دورِ حاضر میں طبی ماہرین نے دنیا کے اکثر مہلک امراض کا علاج یا تو دریافت کر لیا ہے یا پھر ان پر قابو پانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ مثال کے طور پر چیچک، ہیضہ، پولیو وغیرہ کے لیے موثر دوائیں موجود ہیں لیکن ایک ایسا مرض آج بھی ان سائنس دانوں کے قابو سے باہر ہے۔ جس کا نام ملیریا ہے۔ ملیریا کے لفظی معنی ''بری ہوا'' ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر تک لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ملیریا کی جڑ دلدلی علاقوں سے نکلتی ہوئی بدبودار ہوائیں تھیں۔

گرم ملکوں کے باشندے مچھر کی خطرناک عادات سے خوب واقف ہیں۔ ہر سال لاکھوں لوگ مچھر کے کاٹنے سے ملیریا جیسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کافی لوگ خصوصاً بچے اس سے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ اس دور میں ہوائی جہاز کے سفر کے عام ہونے کی وجہ سے ان جہازوں کے ذریعے ملیریا کی وبا سرد ملکوں میں بھی پھیل رہی ہے۔ سرد علاقوں کے باشندے دو وجوہات کی بنا پر خوش قسمت ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملیریا پھیلانے والے مچھر دنیا کے شمالی علاقوں کی سردی برداشت نہیں کر سکتے۔ دوسرے مچھر کی جو خاص قسم برطانیہ میں پائی جاتی ہے اس کے پیٹ میں ملیریا کے جراثیم نہیں رہ سکتے۔

عام طور پر برصغیر میں سفر کرنے والے لوگ مچھر کے کاٹنے اور اس کے اثرات سے بچنے کے لیے مختلف احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہیں مثلاً جال نما پردے، خاص کیمیائی چھڑکاؤ، خاص دھویں والی شمع اور بجلی کی مشینیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کئی قسم کی گولیاں بھی لینی پڑتی ہیں لیکن ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود بھی مچھر ہمیں کاٹتے رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مچھر کسی ایک آدمی کو تو کاٹتا ہے لیکن پاس بیٹھے دوسرے آدمی کا خون پسند نہیں کرتا۔

حال ہی میں ہالینڈ کے سائنسی ماہرین نے اعلان کیا ہے کہ مچھر کی مسلسل تحقیقات کے بعد یہ انکشاف ہوا ہے کہ مچھر جانور کے جسم سے نکلتی ہوئی بو کی طرف راغب ہوتے ہیں جن میں ایک وہ ہے جو انسانوں کے پیروں کی انگلیوں میں سے نکلتی ہے اور ایک خاص قسم کی پنیر کی مانند ہے۔ اس سلسلے میں مزید تجربات کی منصوبہ بندی جاری ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس پنیر کی بُو صرف چند ہی منٹ تک برداشت کر سکتے ہیں۔

(34)

سوال: خوبصورت جسم اور شخصیت ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے مگر ان کے حصول کے لیے کیا مصنوعی طریقوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے؟ دلائل سے ثابت کریں۔

بنیادی نکات:

☆ انسانی شخصیت میں جسم کا کردار۔

☆ خداداد ڈیل ڈول۔

☆ مصنوعی طریقے۔

ہر شخص اپنی جسامت کے لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ کوئی فربہ ہے تو کوئی دُبلا، کوئی دراز قامت تو کوئی پستہ قد۔ انسان کی جسمانی وضع قطع اور ہیئت کا زیادہ انحصار اُس کے والدین پر ہوتا ہے یعنی اس کا ڈیل ڈول اور ناک نقشہ اُسے وراثت میں ملتا ہے۔ ورثہ میں ملی ہوئی جسامت کے علاوہ دوسری چیزیں جو جسمانی ساخت پر اثرانداز ہوتی ہیں ان میں کھانے پینے کی مقدار، اُن کا معیار اور دن بھر میں کی جانے والی مشقت شامل ہیں۔ نظام استحالہ (میٹابولزم) جو کہ غذا کو توانائی میں تبدیل کرتا ہے، جسمانی ساخت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے خلیے غذا کو تیزی سے توانائی میں بدلتے ہیں وہ عام طور پر دبلے پتلے رہتے ہیں اور جن کا نظام سست ہے ان کی غذا چربی میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ایسے لوگ عموماً موٹاپے کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ماڈلنگ، فیشن اور فلم انڈسٹری جیسے شعبوں میں مخصوص لوگوں کا چناؤ کیا جاتا ہے جن میں بیشتر دراز قد، دبلے اور پرکشش خدوخال کے ساتھ ساتھ زبردست شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں غلط مشورے دیکھ کر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور بیشتر اس الجھن کا شکار ہوتے ہیں کہ ان کی جسامت رنگت اور ڈیل ڈول نامناسب ہیں، لہٰذا اس پر توجہ دینا لازمی ہے۔ نتیجتاً وہ طرح طرح کے لوشنوں، کریموں اور دوائیوں کا سہارا لیتے ہیں، یہ سمجھے بغیر کہ یہ نہ صرف پیسے کا زیاں ہے بلکہ جلد اور صحت کی بربادی بھی ہے۔

نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ خوبصورت نظر آنے کی فکر میں پریشان نہ ہوں۔ جوانی میں وزن میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ صحت مند غذا اور ورزش سے اسے صحیح رکھا جاسکتا ہے۔ صحت بذاتِ خود ایک نعمت ہے اور بہت بڑی خوبصورتی ہے۔

یں۔ پاکستان میں مچھر کے پھیلنے کی کیا
بر تجزیات کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً

کرلیا ہے یا پھر ان پر قابو پانے میں کافی
ئیں موجود ہیں لیکن ایک ایسا مرض آج
ہوا'' ہیں کیونکہ انیسویں صدی کے آخر

سال لاکھوں لوگ مچھر کے کاٹنے سے
، ہیں۔ اس دور میں ہوائی جہاز کے سفر
ی ہے۔ سرد علاقوں کے باشندے دو
ؤں کی سردی برداشت نہیں کر سکتے۔
ہ سکتے۔
ے بچنے کے لیے مختلف احتیاطی تدابیر
یں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ کئی قسم
ہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے
ا خون پسند نہیں کرتا۔
ں کے بعد یہ انکشاف ہوا ہے کہ مچھر
، پیروں کی انگلیوں میں سے نکلتی ہے
ن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر

(35)

سوال: حقوق العباد کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین عمل ہے۔ دورِ حاضر میں انسان اس جذبے سے کس قدر سرشار ہے۔ مثالوں سے واضح کریں۔ (حدالفاظ 300 سے 350)

بنیادی نکات:

☆ خدمتِ خلق کا جذبہ۔

☆ آج کے دور میں خدمتِ خلق کی ضرورت۔

☆ برداشت کا جذبہ۔

انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے مل کر رہتا ہے۔ خداوند کریم نے انسان کو دنیا میں اسی لیے اپنا خلیفہ مقرر فرمایا کہ وہ احساس محبت رکھتا ہے۔ یہ احساس ہی ہے جو انسان کو اعلیٰ اخلاق سکھاتا ہے۔ جن میں سب سے اہم وصف خدمتِ خلق ہے۔ جس دل میں دوسروں کی محبت کا جذبہ نہیں وہ دل نہیں بلکہ پتھر کا ٹکڑا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی انبیا آئے ہیں ان سب نے خدمتِ خلق کی تعلیم دی ہے۔ تمام مذاہب کی الہامی کتابوں سے انسان کو یہی تعلیم ملتی ہے کہ آپس میں ہمدردی کرو اور خدمتِ خلق کو اپنا معمول بناؤ۔ اسی چیز کا نام انسانیت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان ذاتی منفعت کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہتا ہے۔ اپنے اور بال بچوں کے آرام و آسائش کے لیے مشکل سے مشکل کام کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے لیکن سب سے بہتر انسان وہ ہے جو ذاتی منفعت کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کو فائدہ پہنچائے اور ملک و قوم کی بہتری اور بھلائی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے۔ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کا بھی یہی شیوہ تھا کہ شب و روز مخلوقِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کرنا، اپنا ہو یا غیر ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہونا سب سے بڑا انسانی فریضہ ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ خوبی کسی میں نہ ہو تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان کہلاتا ہے۔ درحقیقت انسان کی پیدائش کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ بقول شاعر:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّ وبیاں

خدمتِ خلق کا جذبہ اگر ہر انسان کے دل میں پیدا ہو جائے تو دنیا بہشت بن جائے۔ خدمتِ خلق بہترین عبادت ہے۔ خدا ان لوگوں کو بہت عزیز رکھتا ہے جن کے دلوں میں یہ مبارک جذبہ پایا جاتا ہے۔